سُوۡرَۃُ الۡفَاتِحَۃِ مَکِّیَّۃٌ

1 5

سورۂ فاتحہ مکّہ میں نازل ہوئی

وَھِیَ سَبۡعُ اٰیَاتٍ رُکُوۡعُھَا

اِس میں 7 آیات اور 1 رکوع ہے

سورۃ (1) فاتحہ (2) مکی (3) ہے اس میں سات (4) آیات اور ایک رکوع (5) ہے۔

فاتحہ قرآن کریم کی پہلی سورۃ۔ سورۃ کو سورۃ کہنے کی وجہ:

1: قرآن کریم کی سورتوں کو جو سورت کہتے ہیں اس کی وجہ تسمیہ میں متعدد اقوال ہیں۔ سب سے صاف یہ ہے کہ سورت شہر کی فصیل کو کہتے ہیں جس سے شہر محدود ہو جاتا ہے۔ اسی مناسبت سے قرآن مجید کی آیات معینہ محدودہ پر سورت کا اطلاق کیا گیا ہے۔

قرآن کریم میں بھی آٹھ جگہ سورت کا لفظ آیا ہے اس سے بھی قرآن کریم کا ایسا حصہ ہی مراد ہے جس میں پورا مطلب اور منشاء بیان کیا گیا ہے بلکہ اسی نسبت سے قرآن کریم میں اس پر سورت کا اطلاق ہوا ہے۔ پس اس کی پیروی میں ان مجموعہ آیات پر جو درحقیقت معین و محدود اور اپنے ماقبل و مابعد سے علیحدہ ہیں۔ سورت کا اطلاق کرنا نہایت درست و صحیح ہے۔

قرآن کریم میں ایک سو چودہ سورتیں ہیں جن کی ترتیب خود رسول ﷺ فرما گئے تھے اور اکثر نام بھی رسول اللہ ﷺ کے رکھے ہوئے ہیں اور کچھ سورتوں کے نام ایک سے زیادہ بھی روایات میں موجود ہیں جیسے زیر نظر سورۂ مبارکہ کے نام ۳۶ تک علمائے اسلام نے تحریر کئے ہیں۔

ایک قول یہ ہے کہ سورۃ کے لفظی معنی بلندی یا بلند منزل کے ہیں۔ جیسے السورۃ الرافعۃ (لسان) السورۃ المنزلۃ الرفیعہ (راغب) اس لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح دنیا کی دوسری کتابیں مختلف بابوں میں تقسیم ہوتی ہیں اسی طرح قرآن مجید کے ہر باب کو سورۃ کہتے ہیں۔ گویا ہر سورۃ ایک بلند منزل کا نام ہے۔ ان میں سے جس نسبت سے بھی سورۃ کو سورۃ کہا جائے صحیح اور درست ہے۔

سورۃ فاتحہ کے دوسرے نام احادیث میں:

2: سورۂ فاتحہ کے بہت سے نام کتب احادیث و تفاسیر میں بتائے گئے ہیں اور علماء نے چھتیس تک شمار کئے ہیں ان میں صرف دس کا ذکر کیا جاتا ہے۔ زیادہ دیکھنے کا شوق ہو تو علامہ سیوطیؒ کی ''الاتقان'' کا مطالعہ کریں۔

1: ''فاتحۃ الکتاب'' یہ نام اس لئے تجویز ہوا کہ قرآن مجید کا اس سے افتتاح ہوتا ہے اور نماز کی قراءت بھی اسی سے شروع ہوتی ہے

یا نماز میں اس کی قراءت ضروری ہے اور بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ آسمان سے سب سے پہلے نازل ہونے والی سورت یہی ہے۔ اسی لئے اس کا نام "فاتحۃ الکتاب" ہے۔

2: "الحمد" یہ اس لئے کہ اس سورت کے اندر الحمد کا لفظ موجود ہے یعنی دوسری آیت کے شروع میں الحمد کا لفظ ہے اور دوسری سورتوں کے اسماء بھی سورتوں کے اندر موجود ہیں اور ہر سورۃ کا نام اس سورۃ کی کسی نہ کسی آیت کے اندر ہی سے لیا گیا ہے لہٰذا اس سورت کا نام بھی سورت کے اندر کی آیات ہی سے لیا گیا۔

3: "ام القرآن" اس کی بہت سی وجود بیان کی گئی ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ ہر چیز کی ماں اس کی اصل ہے اور تمام قرآن مجید کی تقریر کی اصل سورۃ فاتحہ ہے لہٰذا اسی نسبت سے اس کو "ام القرآن" فرمایا گیا ہے کیونکہ قرآن مجید کے مضامین کا خلاصہ الٰہیات، معاد، قضاو قدر اور استدعا ہے اور ان چاروں کا خلاصہ سورۂ فاتحہ کے اندر موجود ہے۔ پہلی تین آیتیں الرحمٰن الرحیم تک الٰہیات کا بیان ہے۔ چوتھی آیت معاد پر دلالت کرتی ہے۔ پانچویں آیت: "اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ۝" سے جبر وقدر کی نفی اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہر قضاوقدر کے اثبات پر دلیل ہے۔ اور چھٹی اور ساتویں آیت یعنی: "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ سے وَلَا الضَّآلِّیْنَ ۝" تک استدعا پر واضح دلیل ہے۔

4: "سبع مثانی یہ نام قرآن مجید کی سورۃ الحجر کی آیت نمبر 87 سے لیا گیا ہے چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہے: وَ لَقَدْ اٰتَیْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ (۱۵:۸۷) "اور ہم نے آپ کو سات دہرائی جانے والی آیات عطا کیں"۔

صحیح حدیث میں ہے کہ: "سات دہرائی جانے والی آیات" سے مراد سورۃ فاتحہ ہے کہا گیا ہے کہ اس کو مثانی اس لیے کہتے ہیں کہ:

الف: نماز کی ہر رکعت میں دہرائی جاتی ہے۔ نماز فرض ہو، نفل یا سنت، نماز عید ہو یا جنازہ، نماز تسبیح ہو یا استغفار۔

ب: رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: فاتحہ وہ سورت ہے جو سابقہ تمام کتابوں سے مستثنیٰ ہے خدا کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اس سورت کی مثل نہ تورات وانجیل میں ہے اور نہ زبور وقرآن میں اور یہ سورت فاتحہ ہے جس کا مثل قرآن مجید میں بھی موجود نہ ہے۔

ج: اس کی سات آیات ہیں جو بار بار دہرائی بھی جاتی ہیں اور جو شخص اس سورۂ مبارکہ کی تلاوت کرتا ہے وہ پورے قرآن مجید کا ثواب حاصل کر لیتا ہے۔

د: اس کا نزول دو بار ہوا، پہلی بار مکہ مکرمہ میں اور دوسری بار مدینہ طیبہ میں۔

ہ: اس کو نمازوں میں دو بار بھی پڑھا جاتا ہے ایک بار فرض سمجھتے ہوئے اور دوسری بار قرآن مجید کی ایک سورت ہونے کے واسطہ سے۔

(امام رازی، تفسیر کبیر)

و: اس میں اللہ تعالیٰ کی ثناء ومدح بیان کی گئی ہے۔

5: "الوافیہ" سورۃ فاتحہ کو اس نام سے اس لئے موسوم کیا جاتا ہے کہ نماز کے اندر اس کی تنصیف نہیں کی جاسکتی یعنی باقی سورتوں کی طرح نماز میں اس کا آدھا حصہ کم یا زیادہ پڑھ لینے سے نماز صحیح نہیں ہوتی حالانکہ باقی سورتوں میں سے کسی کا آدھا یا کچھ حصہ بھی تلاوت کر لیا جائے تو نماز درست ہو جاتی ہے۔ بعض کے نزدیک اس کی مقدار تین آیات یا ایک بڑی آیت بتایا گیا ہے۔ نیز یہ کہ اس سورت کو دو رکعت میں تقسیم بھی نہیں کیا جاسکتا۔

6: "الکافیہ" نماز کی ایک رکعت میں اگر صرف سورۂ فاتحہ پڑھ لی جائے اور علاوہ ازیں قرآن مجید کا کوئی حصہ تلاوت نہ کیا جائے تو نماز درست ہو جاتی ہے اگرچہ ایک سنت اس میں سے رہ گئی۔ لیکن سورۂ فاتحہ چھوڑ کر باقی قرآن کا کوئی حصہ تلاوت کر لیا تو نماز صحیح نہ ہوئی۔ چنانچہ: محمود بن ربیع حضرت عبادہ بن صامت ؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "ام القرآن اپنے علاوہ سورتوں کا بدل

ہے مگر اس کے علاوہ کوئی سورۃ اس کا بدل نہیں۔''

7: ''الشفاء'' یعنی بیماریوں کے لئے شفا۔ یقینی بات ہے کہ کچھ روحانی بیماریاں ہوتی ہیں اور کچھ جسمانی۔ جسمانی بیماریوں سے روحانی بیماریاں پیدا ہوجاتی ہیں اور کبھی روحانی بیماریوں سے جسمانی بیماریاں لاحق ہوسکتی ہیں اور فاتحہ ان دونوں اقسام کے لئے یقیناً شفا ہے۔ اس لئے فاتحہ کا ایک نام ''دعا'' بھی ہے۔ اس کے ساتھ قرآن مجید کی آیت ''فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ'' پر ایک نظر مزید آپ کی تسلی کردے گی۔

8: ''الصلوٰۃ'' سورۂ فاتحہ کا ایک نام ''الصلوٰۃ'' بھی ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ:

لا صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب (صحیحین) سورۂ فاتحہ کے سوا کوئی نماز نہیں ہوسکتی پس اس لئے نبی کریم ﷺ نے اس کو ''سورۃ الصلوٰۃ'' کے نام سے پکارا ہے۔ یعنی وہ سورت جس کے سوا نماز نہیں پڑھی جاسکتی۔ ایک انسان اس سے زیادہ جس قدر قرآن میں سے پڑھے اور سیکھے مزید معرفت وبصیرت کا ذریعہ ہوگا لیکن قیام نماز میں اس سے کم کوئی چیز نہیں ہوسکتی۔ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''الصلوٰۃ'' میرے اور میرے بندے کے درمیان تقسیم ہے اور اس سے مراد بھی سورۂ فاتحہ ہے۔

9: ''السوال'' بھی اس سورت کا نام ہے وہ کون ہے جو اللہ تعالیٰ سے سوال کرنے سے مستغنی ہے؟ ہر ایک کو حاجت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے سوال کرے اور وہ اپنی ضرورت طلب کرے۔ اپنی دینی اور دنیوی ضرورت کے لئے اللہ تعالیٰ سے مانگے۔ حدیث میں ہے کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے یعنی حدیث قدسی ہے: ''جو شخص میرے سوال سے میرے ذکر میں مشغول ہو میں اسے اس سے افضل عطا کرتا ہوں جو دوسرے سوالیوں کو دیتا ہوں۔'' مطلب یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ کی تلاوت کرکے اپنے آپ کو اس کے مطابق بنا کر بندہ جب سوال کرتا ہے تو میں اس کے سوال کو پورا کرتا ہوں۔ اسی نسبت سے اس سورۂ مبارکہ کا نام ''السوال'' رکھا گیا۔

10: ''الدعا'' اس سورۂ مبارکہ میں دعا مانگنے کا طریقہ سکھایا گیا ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جب طلب ہو تو کس سے مانگے اور کیسے مانگے؟ جب دینی طلب ہو تو دنیا اس کے اندر آجاتی ہے۔ اسی نسبت سے اس سورت کا نام ''دعا'' بھی احادیث صحیح سے ملتا ہے اور اس سورت کا باہمی تعلق دعا اور جواب دعا کا ہے۔ اس دعا کی ابتداء اس ہستی کی تعریف سے کی جارہی ہے جس سے ہم دعا مانگنا چاہتے ہیں یہ گویا اس امر کی تعلیم ہے کہ دعا جب مانگو تو مہذب طریقہ سے مانگو یہ کوئی تہذیب نہیں کہ منہ کھولتے ہی جھٹ اپنا مطلب پیش کردیا، تہذیب کا تقاضا یہ ہے کہ جس سے دعا کررہے ہو پہلے اس کی خوبی کا اس کے احسانات اور اس کے مرتبے کا اعتراف کرو۔

قرآن کریم کی سورتوں کی تقسیم نہایت اہم تقسیم ہے:

3: قرآن کریم کی سورتوں کی ایک اہم تقسیم بہ لحاظ زمانہ نزول کی گئی ہے جو سورتیں نزول ہجرت نبوی یعنی رسول اللہ ﷺ کے زمانہ قیام مکہ میں نازل ہوئیں خواہ ان کا نزول حدود شہر مکہ سے باہر ہی ہوا ہو، مکی کہلاتی ہیں اور جو سورتیں بعد ہجرت نبوی ﷺ یعنی زمانہ قیام مدینہ میں نازل ہوئیں وہ مدنی کہلاتی ہیں خواہ ان کا نزول حدود شہر مدینہ سے باہر ہی ہوا ہو۔ لیکن یہ تقسیم صرف عمومی حیثیت سے ہے ورنہ بارہا ایسا ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مدنی سورت کے اندر مکی آیتیں رکھ دیں ہیں، اور اسکے برعکس بھی حکم فرمایا ہے۔

ربط مضمون ومناسبت مقام کا صحیح ولطیف تر احساس رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر اور کسی کو ہوسکتا تھا؟ اس لئے کسی متعین آیت کے باب میں اس کے مکی یا مدنی ہونے کا فیصلہ جزم کے ساتھ کرنا دشوار ہے اس باب میں جو روایتیں آئی ہیں ان میں اکثر وبیشتر درجہ تواتر کو نہیں پہنچتیں محض مفید ظن ہیں، مفید یقین نہیں اور اس قسم کے قیاسی معیار کو مثلاً ''یا ایھا الناس'' سے شروع ہونے والی آیتیں لازمی طور پر مکی اور ''یا ایھا الذین امنوا'' سے شروع ہونے والی آیتیں لازمی طور پر مدنی ہوں گی روایات کی رو سے محض اکثری وتخمینی ہیں البتہ مضمون

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ①

اللہ (6) کے نام (7) سے جو بہت ہی مہربان (8)، بہت ہی پیار کرنے والا ہے (9) (پڑھو، (10) پڑھاؤ)۔1

کے پیش نظر ان کو کلی اور قطعی کہا جاسکتا ہے۔

وہ حروف جو سورۂ فاتحہ میں استعمال نہیں ہوئے:

4: اوران آیات میں سے پہلی آیت بسم الرحمٰن الرحیم ہے۔ اس سورۂ مبارکہ میں کل انتیس الفاظ اور ایک سو اکتالیس حروف ہیں جن میں سے:

الف=24، ب=4، ت=3، ث=x، ج=x، ح=5، خ=x

د=۴، ذ=1، ر۔8، ز=x، س=3 ش=x ص=2

ض=2، ط=2، ظ=x ع=6، غ=2، ف=x ق=1

ک=3، ل=22، م=15، ن=11، و=4، ہ=5، ی=14

قرآن مجید کی کُل آیات بھی شمار کر لی گئی ہیں اور ان کی میزان الاتقان سیوطیؒ کے مطابق 6666 ہے اور قرآن مجید کے کُل الفاظ 77934 اور کل حروف کی تعداد 323760 ہے۔ قرآن مجید کے شیدائیوں نے اس جیسی بہت سی عرق ریزیاں کی ہیں جو آج بھی ان کے عشق کی نشاندہی کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو اجر عظیم عطا فرمائے۔ آمین۔ ہاں! یہ باتیں تخمیناً ہیں، جو مطلق صحیح نہیں۔

اور سورۂ فاتحہ میں درج ذیل سات حروف استعمال نہیں ہوئے اور اتفاق یہ ہے کہ ساتوں حروف معجمہ ہیں وہ حروف یہ ہیں ثاء، جیم، خاء، زاء، شین، ظاء، اور فاء، (ث، ج، خ، ز، ش، ظ، اور ف) مفسرین نے اس کی بڑی عجیب عجیب وجوہ بیان کی ہیں اور خصوصاً امام رازی نے اس کا سبب یہ بیان کیا ہے کہ یہ ساتوں حروف مقامات عذاب ہیں اور پھر ان سے نکلے ہوئے وہ الفاظ درج کیے ہیں جو عذاب پر دلالت کرتے ہیں مثلاً ثاء سے ثبور (۴۵:۱۴) جیم سے جہنم (۱۵:۴۳)، (۷:۱۷۸) خاء سے خزی (۱۶:۲۷) زاء سے زفیر (۱۱:۱۰۶)، (۴۴:۴۳) شین سے شہیق (۱۱:۱۰۶) ظاء سے ظل اور ظلیل (۷۷:۳۰،۳۱) فاء سے یفرقون (۳۰:۱۴) اور افتری (۲۰:۶۱) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان سے مراد جہنم کے سات دروازے ہیں جیسے (الحجر:۴۴) میں بیان کیا گیا ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس سورت سے سات حرف ساقط فرمائے ہیں اور ساتوں حروف عذاب پر دلالت کرتے ہیں اور اس پر اشارہ ہے کہ جو شخص اس سورۃ کو پڑھے گا وہ دوزخ کے ان سات دروازوں یعنی ساتوں طبقات دوزخ سے امان پائے گا۔ (کامل علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے اور وہی اصل حقیقت کو جانتا ہے)۔

رکوعات کی تقسیم نبی کریم ﷺ سے بعد کی تقسیم ہے:

5: سورت کے اندر کی ایک بڑی تقسیم کا نام رکوع ہے۔ بڑی سورتوں میں اکثر رکوع دس سے پندرہ آیتوں تک رکھے گئے ہیں اگرچہ کہیں کہیں ان سے کم یا زیادہ آیتیں بھی موجود ہیں۔ اور یہ اتنی مقدار ہے جو تقریباً ایک رکعت میں پڑھی جاسکتی ہے۔ لیکن اس کی پابندی لازمی اور ضروری نہیں ہے کیونکہ یہ نبی کریم ﷺ سے ثابت نہیں۔ سورۂ فاتحہ کے علاوہ تیسویں پارہ کی آخری 34 چھوٹی سورتوں میں بھی ایک ایک رکوع ہی شمار کیا گیا ہے نماز میں سورہ فاتحہ پڑھ لینے کے بعد قرآن مجید میں سے کوئی چھوٹی سورۃ یا کسی بڑی سورۃ کا ایک رکوع یا چند

آیتیں پڑھنا مسنون ہے البتہ فرض نماز کی آخری ایک یا دو رکعت میں صرف فاتحہ پڑھ لینے کے بعد بھی رکوع کیا جا سکتا ہے۔ قرآن مجید میں رکوع کی تعداد 558 شمار کی گئی ہے۔

لفظ اللہ اسم ذات ربّ ذو الجلال ہے:

6: لفظ ''اللہ'' کی اصل ا، ل، ہ ہے۔ بعض کا قول ہے کہ ''اللہ'' اصل میں ''الٰہ'' ہے ہمزہ تخفیفاً حذف کر دیا گیا ہے اور اس پر الف لام (تعریف) لا کر باری تعالیٰ کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ اسی تخصیص کی بناء پر فرمایا: هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ﴿٦٥﴾ (۱۹:۶۵) کیا تمہیں اس کے کسی ہم نام کا علم ہے۔

''اللہ، الٰہ، آلھہ، الٰہین، اللھم میں سے اللہ'' کا لفظ قرآن مجید میں ۲۶۹۷ بار آیا ہے۔ ''الٰہ'' ۱۱۱ بار اور ''الٰہین'' صرف دو بار ''آلھۃ'' کا لفظ ۳۴ بار اور ''اللھم'' پانچ بار استعمال کیا گیا ہے۔

اسم کو اسم کیوں کہتے ہیں؟

7: نام کو عربی زبان میں اسم کہتے ہیں اور ''اسم'' کی ''اصل'' س م و ہے۔ سما، یسمو، سمواً، الاسم کسی چیز کی علامت جس سے اسے پہچانا جائے۔ دراصل ہر شے کے بالائی حصہ کو کہتے ہیں۔ اسم کی جمع اسماء اور تصغیر سمی۔ اسم کو اسم اس لئے کہتے ہیں کہ اس سے مسمّٰی کا ذکر بلند ہوتا ہے اور اس کی معرفت حاصل ہوتی ہے یعنی پہچانا جاتا ہے۔

بسم اللہ کے الفاظ قرآن مجید میں تین بار آئے ہیں۔

1: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (فاتحہ ۱:۱)

2: وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا (ہود ۱۱:۴۱)

3: اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَ اِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿٣٠﴾ (النمل ۲۷:۳۰)

الرحمٰن اور الرحیم صرف اللہ ہی کی ذات ہے:

8: ''بہت ہی مہربان بہت ہی پیار کرنے والا ہے'' یعنی ''الرحمٰن'' ''الرحیم'' کی ''اصل'' ر، ح، م ہے۔ الرحمۃ وہ رقت قلب جو مرحوم پر احسان کی مقتضی ہو۔ پھر کبھی اس کا استعمال صرف رقت قلب کے معنی میں ہوتا ہے اور کبھی صرف احسان کے معنی میں۔ جب اس کے ساتھ ذات باری تعالیٰ متصف ہو تو اس سے صرف احسان مراد ہوگا جیسا کہ مروی ہے: ''ان الرحمۃ من اللہ انعام و افضال و من الادمیین رقۃ و تعطف'' یعنی اللہ کی طرف سے رحمت اس کے انعام و فضل سے عبارت ہوتی ہے اور لوگوں کی طرف سے رقت اور شفقت کے معنی میں آتی ہے۔

'''' یہ دونوں فعلان اور فعیل کے وزن پر مبالغہ کے صیغے ہیں۔ جیسے ندمان وندیم۔ پھر رحمٰن کا اطلاق اسی ذات پر ہوتا ہے جس نے اپنی رحمت کی وسعت میں ہر چیز کو سما لیا ہو، اس لئے اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی پر اس لفظ کا اطلاق جائز نہیں ہے اور الرحیم بھی اسمائے حسنیٰ میں سے ہے اور اس کے معنی بھی بہت ہی زیادہ رحمت کرنے والے کے ہیں اور اس کا اطلاق دوسروں پر بھی جائز ہے قرآن مجید میں ہے: ''رؤف رحیم'' (۹:۱۲۸) کے الفاظ رسول اللہ ﷺ کے لئے بھی استعمال ہوئے ہیں۔

اور بعض نے رحمٰن اور رحیم میں یہ فرق بیان کیا ہے کہ رحمٰن کا لفظ دنیوی رحمت کے اعتبار سے بولا جاتا ہے جو مؤمن اور کافر دونوں کو

شامل ہے اور رحیم اخروی رحمت کے اعتبار سے ہے جو خاص کر مومنین پر ہوگی۔

''الرحمٰن'' کا لفظ قرآن مجید میں 57 بار آیا ہے اور ''الرحیم'' کا 34 بار۔ سورۂ فاتحہ کی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم چونکہ آیات قرآنی میں شامل ہے اس لیے اس میں الرحمٰن الرحیم کو شامل کیا گیا ہے اور باقی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں سے ''الرحمٰن''، ''الرحیم'' کے الفاظ شامل نہیں کئے گئے اس لیے کہ وہ قرآن مجید میں شامل ہی نہیں وہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم محض دو سورتوں کے درمیان فصل کے لئے بیان ہوئی ہے اگرچہ اس میں اختلاف بھی ہے۔

کیا تسمیہ فاتحہ کی آیت ہے؟

9: مکہ مکرمہ اور کوفہ کے قراء اور اکثر فقہاء حجاز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو سورۂ فاتحہ کی پہلی آیت تسلیم کرتے ہیں۔ اس قول کی تصدیق عبداللہ بن مبارکؒ اور سفیان ثوریؒ کے بیان سے بھی ہوتی ہے اس سلسلہ کی وضاحت اس طرح ہے کہ:

1: ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سورۂ فاتحہ پڑھتے تو بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ (1) کو ایک آیت بناتے اور اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۙ (2) کو دوسری آیت قرار دیتے۔ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ۙ (3) اور مٰلِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ ؕ (4) کو چوتھی آیت بناتے۔ (۵) اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ ؕ کو پانچویں اور اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ۙ (6) کو چھٹی آیت قرار دیتے اور صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ ۙ غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ وَ لَا الضَّآلِّيۡنَ ۧ (7) کو ساتویں آیت بناتے۔ آیات کا یہ شمار آپ ﷺ کے وقفوں سے ثابت ہے۔

2: ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''فاتحہ الکتاب سات آیات ہیں اور ان کی پہلی آیت ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' ہے''۔

3: ابی بریدہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''کیا تجھے اس آیت کی خبر ہے جو حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام کے بعد میرے سوا کسی نبی ﷺ پر نازل ہوئی؟'' میں نے عرض کیا نہیں! آپ نے فرمایا ''جب نماز شروع کی جائے تو قرآن کی کونسی آیت شروع ہوتی ہے؟'' میں نے کہا ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم''۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہی ہے یہی ہے'' یعنی یہی وہ آیت ہے جو سلیمان علیہ السلام اور محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل کی گئیں چنانچہ سورۃ النمل ۲۷ کی آیت تیس میں اس کا ذکر ہے اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تسمیہ قرآن کریم سے ہے قرآن سے باہر نہیں اور خصوصاً فاتحۃ الکتاب کی پہلی آیت ہے۔

4: ثعلبی اپنی اسناد کے ساتھ امام جعفر صادقؒ سے وہ اپنے والد گرامی امام محمد باقرؒ سے وہ جابر بن عبداللہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے فرمایا ''جب تو نماز قائم کرتا ہے تو کیسے کہتا ہے؟ جابر نے کہا میں کہتا ہوں ''الحمد للہ ربّ العٰلمین'' یہ سن کر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا، نہیں کہہ ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم''۔

5: ثعلبی نے اپنی اسناد کے ساتھ حضرت علی بن ابی طالبؓ سے بھی روایت نقل کی ہے کہ جب میں نماز میں سورۂ فاتحہ کو شروع کرتا ہوں تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھتا ہوں اور فرماتے جس نے اس کو پڑھنا چھوڑ دیا اس نے سورۃ کی آیت میں کمی کی۔

6: ثعلبی نے اپنی اسناد کے ساتھ سعید بن جبیرؓ سے روایت کی ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے ''وَ لَقَدۡ اٰتَيۡنٰكَ سَبۡعًا مِّنَ الۡمَثَانِىۡ'' (۱۵:۸۷) یعنی آپ ﷺ کو دہرائی جانے والی سات آیات کریمات دی گئی ہیں کی تفسیر میں فاتحۃ الکتاب ہے اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو نہ چھوڑو کیونکہ یہ سورۂ فاتحہ کی ایک آیت ہے۔

8: ثعلبی نے اپنی اسناد کے ساتھ ابوہریرہ ؓ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے (یعنی حدیث قدسی ہے) کہ میں نے اپنے اور اپنے بندے کے درمیان سورۂ فاتحہ کو آدھا آدھا تقسیم کیا ہے۔ جب بندہ ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کہتا ہے تو اللہ سبحانہ فرماتا ہے میرے بندے نے میری حمد بیان کی اسی طرح ساتوں آیتوں کے جوابات بیان فرمائے۔''

9: ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مسجد میں تھا اور رسول اللہ ﷺ صحابہ ؓ سے گفتگو فرمارہے تھے کہ ایک شخص مسجد میں داخل ہوا اور نماز شروع کر دی، تعوذ کو پڑھا اور پھر الحمد للہ سے پڑھنا شروع کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے سنا اور اسے فرمایا اے شخص! تو نے اپنی نماز قطع کر لی کیا تو نہیں جانتا کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سورۂ فاتحہ سے ہے؟ جس نے اسے چھوڑ دیا تو اس نے اس سے ایک آیت چھوڑ دی اور جس نے ایک آیت کو چھوڑ دیا اس نے اپنی نماز قطع کر لی اس لیے کہ فاتحۃ الکتاب کے بغیر صلوٰۃ نہیں ہوتی تو جس نے اس سے ایک آیت ترک کر دی اس کی نماز باطل ہوگئی۔

10: طلحہ بن عبید اللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے بسم للہ الرحمٰن الرحیم کو چھوڑ دیا اس نے قرآن مجید کی ایک آیت کو چھوڑ دیا۔ معلوم رہے کہ یہ سب روایات تفسیر کبیر میں امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے شیخ ابی اسحاق ثعلبیؒ کی تفسیر سے مع شئی زائد نقل کی ہیں۔ آپ چاہیں تو اصل کی طرف مراجعت کریں۔

11: رسول اللہ ﷺ نے ابی بن کعب ؓ سے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کی کتاب میں اعظم آیت کونسی ہے؟ ابی بن کعب ؓ نے کہا: ''بسم للہ الرحمٰن الرحیم''، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''صحیح ہے''۔

اس سے یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ سورۃ النمل کی آیت ۳۰ میں جو بسم اللہ ہے وہ پوری آیت نہیں بلکہ آیت کا ایک جزء ہے کیونکہ پوری آیت ہے: اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَ اِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِۙ۝۳۰ زیر نظر حدیث میں آپ ﷺ کا ارشاد پوری آیت سے ہے۔ اور پوری مکمل آیت سب سے پہلے سورۂ فاتحہ ہی کی آیت ہوسکتی ہے۔

12: امیر معاویہ ؓ مدینہ منورہ میں آئے اور لوگوں کے ساتھ نماز پڑھی یعنی معاویہ نے جماعت کرائی جب اس میں سورۂ فاتحہ پڑھی تو بسم اللہ کو جہر نہ پڑھا تو ہر گوشہ سے آواز بلند ہوئی بسم اللہ لرحمٰن الرحیم یعنی معاویہ ؓ بھول گئے تو امیر معاویہ ؓ نے ام القرآن کو دوبارہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے پڑھا۔ ظاہر ہے کہ یہ بات صحابہ ؓ کے اجماع پر دلالت کرتی ہے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سورۂ فاتحہ کی پہلی آیت ہے ایک روایت میں ہے کہ پوری نماز پڑھ چکنے کے بعد مسئلہ پیدا ہوا تو امیر معاویہ ؓ کے دوبارہ نماز پڑھانے پر یہ بات ختم ہوئی اور دوسری صورت پہلی سے بھی قوی ہے۔ فتدبر۔

۱۹۷۱ء کی بات ہے جب کبھی بندہ ناچیز ادارۃ القرآن کراچی کی کتابت کا کام کیا کرتا تھا مولانا نور احمد صاحب مرحوم بانی ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ نے قرآن مجید کی اشاعت کے لئے ناچیز سے مشورہ کیا۔ اس مشورہ میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے فاتحہ کی پہلی آیت ہونے پر گفتگو ہوگئی یہ گفتگو زبانی تھی۔ باتوں ہی باتوں میں طے پایا کہ مولانا مفتی محمد شفیق صاحبؒ بانی دار العلوم کراچی جو مولانا موصوف کے سسر بھی ہوتے تھے سے اس کی تسلی کے لئے رابطہ کیا جائے۔ چنانچہ اگلے روز ''دار العلوم'' میں مفتی صاحب مرحوم ومغفور سے ملاقات کے لیے حاضر ہوئے اور ان کی خدمت میں یہ مسئلہ پیش کیا گیا۔ مفتی صاحب نے اس سلسلہ میں جو اپنی تحقیق بیان فرمائی اس کا ماحصل یہ تھا کہ قرآن کی 112 بسم اللہ جو سورۂ توبہ کے علاوہ باقی سورتوں پر تحریر ہیں ان میں سے ایک بسم اللہ یقیناً قرآن کریم کا جزء ہے اور قراء حضرات جو قرآن کریم کو تراویح میں پڑھتے ہیں ان کو ایک بسم اللہ بلند آواز سے ضرور پڑھنی چاہئے اور یہ بسم اللہ سورۂ نمل کے اندر جو بسم اللہ ہے اس کے علاوہ ہو۔ دل اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ وہ ''بسم اللہ'' سورۂ فاتحہ ہی کی قرار دینا سنت نبوی ﷺ کے زیادہ قریب ہے لہٰذا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ سورۂ

فاتحہ کی ''بسم اللہ'' ہی فاتحہ کی پہلی آیت ہے۔''

بندۂ ناچیز نے عرض کیا کہ حضرت اس پر آپ کی طرف یہ ایک تحریر ہو جائے تو بہت بہتر ہے مولانا نور احمد صاحب مرحوم نے بھی میری پرزور تائید کی لیکن مفتی صاحب مرحوم نے اس پر کچھ تحریر کرنے سے معذرت کر لی۔ تاہم مولانا نور احمد صاحب نے مصمم ارادہ کر لیا کہ جو قرآن مجید ہم ''ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ'' سے طبع کریں گے اس میں سورۂ فاتحہ کی ''بسم اللہ'' پر فاتحہ کی پہلی آیت کا نمبر ایک ضرور دیا جائے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جس کی زندہ شہادت آج بھی موجود ہے مذکورہ ادارہ کے قرآن مجید میں سورۂ فاتحہ کی ''بسم اللہ'' کو آیت نمبر ایک شمار کیا گیا ہے۔

مولونا نور احمد صاحب مرحوم ''رابطہ عالم اسلامی'' کے رکن بھی تھے۔ انہوں نے اس مسئلہ کو ''رابطہ عالم اسلامی'' کے علماء میں پیش کیا اور ان مجالس کی اکثر رپورٹوں کا ذکر ہماری ملاقات میں ایک مدت تک ہوتا رہا۔ الحمدللہ کہ اس کے نتیجہ میں ''الملک فہد بن عبدالعزیز آل سعود'' نے جو قرآن مجید مدینہ طیبہ سے طبع کرائے ان میں بھی سورۂ فاتحہ کی ''بسم اللہ'' کو فاتحہ کی پہلی آیت تسلیم کر لیا گیا جس کی شہادت بھی مدینہ طیبہ کے طبع شدہ قرآن کریم پیش کر رہے ہیں اور ازیں بعد کویت سے جو قرآن کریم طبع ہو رہے ہیں ان میں بھی سورۂ فاتحہ کی ''بسم اللہ'' کو فاتحہ کی پہلی آیت کا مقام مل گیا کیونکہ انہوں نے بھی ''بسم اللہ'' کو سورہ فاتحہ کی پہلی آیت تسلیم کرتے ہوئے ''بسم اللہ'' کے ختم پر آیت کے نشان میں نمبر ایک دے دیا ثم الحمدللہ۔

ازیں بعد بندہ ناچیز نے مولانا نور احمد صاحب سے ایک مجلس میں جو مولانا نصیر الدین چلاسی صاحب مدظلہ العالی کے پاس ایبٹ آباد میں قائم ہوئی یہ گزارش کی مولانا صاحب ماشاءاللہ آپ نے اس سنت نبوی ﷺ کو زندہ کرنے میں بہت کام کیا اب میری گزارش یہ ہے کہ جب ''بسم اللہ'' سورۂ فاتحہ کی آیت نمبر ایک تسلیم ہے تو جہر نماز میں جب امام فاتحہ پڑھتا ہے اور وہ فاتحہ کو الحمدللہ سے شروع کرتا ہے تو گویا وہ فاتحہ کی پہلی آیت کو جہر نہیں کرتا جس کا مطلب صاف ہے کہ وہ فاتحہ کی چھ آیات تلاوت کرتا ہے اور ایک آیت کو یا تو چھوڑ دیتا ہے یو پھر خفی کرتا ہے جس پر تلاوت کا لفظ یقیناً نہیں بولا جا سکتا اور باتوں میں باتوں ہی باتوں میں مولانا چلاسی صاحب مدظلہ نے بھی میری تائید فرما دی لیکن کوئی فیصلہ کن بات نہ ہوئی کہ مجلس برخاست ہو گئی اور اگلے روز ہم واپس اپنے اپنے مقام کی طرف لوٹ گئے اس کے بعد ابھی ملاقات نہیں ہوئی تھی کہ مولانا نور احمد صاحب انتقال فرما گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

یہ دروازہ بند ہو جانے کے بعد بندۂ ناچیز نے مختلف علمائے اسلام سے رابطہ کیا کئی ایک مفتیوں سے استفتاء بھی کیا لیکن تا حال کوئی قابل ذکر جواب نہیں آیا جس کا ذکر کیا جائے۔

''بسم اللہ'' جہر نہ کرنے کی دلیل صحیح مسلم کی یہ حدیث بیان کی جاتی ہے:

عن انس رضی اللہ عنہ صلیت مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وابی بکر و عمر و عثمان فلم اسمع احدا منھم یقرا بسم اللہ الرحمن الرحیم

''انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ، عمر فاروقؓ اور عثمان غنیؓ کے ساتھ نماز پڑھی لیکن ان میں سے کسی نے بھی نماز میں ''بسم اللہ'' کو جہر نہیں پڑھا۔

حالانکہ اس میں سورۂ فاتحہ کا کہیں ذکر نہیں کہ فاتحہ پڑھتے وقت آپ ﷺ نے اور آپ ﷺ کے اصحاب ثلاثہ نے ''بسم اللہ) جہر نہیں پڑھی۔ اس لیے یہاں یہ احتمال موجود ہے کہ فاتحہ کے بعد جب کوئی سورت ملائی تو بسم اللہ جہر نہیں پڑھی جبکہ کوئی سورت جہر پڑھی۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو یہ مسئلہ ہی دوسرا ہے جس کی تفصیل کا یہ مقام نہیں کیونکہ ہمارا موقف یہ ہے کہ ''بسم اللہ'' سورۂ فاتحہ کی پہلی آیت ہے اور اگر

اس کو جہر نہ کیا جائے تو فاتحہ کی ایک آیت جہر نہیں ہوگی اور فاتحہ کو جہر پڑھنے کا ذکر واضح طور پر موجود ہے جس میں کسی کو بھی اختلاف نہیں ہے چونکہ یہ دوسرا مسئلہ ہے کہ ہر سورت پر جو ''بسم اللہ'' تحریر ہے کیا وہ سورۃ کی مستقل آیت ہے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ اس کو ہر سورۃ کا جز نہیں تسلیم کرتے اور امام شافعیؒ ہر سورت کی ایک مستقل آیت تسلیم کرتے ہیں۔

پھر تعجب یہ ہے کہ امام شافعیؒ کے دلائل میں بھی صحیح مسلم ہی کی حدیث پیش کی گئی ہے جس سے امام شافعیؒ نے استدلال کیا ہے کہ ''بسم اللہ'' ہر سورۃ کی ایک مستقل آیت ہے چنانچہ صحیح مسلم میں ہے کہ:

عن انس بن مالک قال بینا رسول اللہ ﷺ ذات یوم بین اظہرنا اذا اغفی اغفاۃ ثم رفع راسہ متبسما فقلنا ما اضحک یا رسول اللہ انزلت علی انفا سورۃ فقراء ''بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ انا اعطینک الکوثر۔ فصل لربک ونحر۔ان شائنک ھو الابتر۔''

''انس بن مالکؓ کا بیان ہے کہ ایک دن ہم رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ ﷺ پر ایک خاص حالت طاری ہوئی جب طاری ہوئی آپ ﷺ خاموش تھے پھر آپ ﷺ نے سر اٹھایا اور آپ ﷺ مسکرا رہے تھے ہم نے عرض کیا، یارسول اللہ ﷺ! آپ ﷺ کس چیز پر مسکرا رہے ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ مجھ پر ابھی ابھی قرآن مجید کی ایک سورۃ نازل ہوئی چنانچہ آپ ﷺ نے سورۃ تلاوت کرنا شروع کی اور آپ ﷺ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے ساتھ پوری سورہ ''الکوثر'' تلاوت فرمائی)۔

جس سے امام شافعی یہ استدلال کرتے ہیں کہ ''بسم اللہ'' ہر سورۃ کی ایک مستقل آیت ہے جیسا کہ ''الکوثر'' کے ساتھ آپ ﷺ نے اس کو تلاوت فرما کر یہ سمجھا دیا کہ ''بسم اللہ الکوثر'' کی ایک مستقل آیت ہے۔اس حدیث سے امام شافعی بسم اللہ ہر سورۃ کا جز ہونے پر استدلال کرتے ہیں۔

جہری نماز میں ''بسم اللہ'' جہر نہ پڑھنے والوں سے میری اتنی مزید گزارش ہے کہ جب آپ مسلم شریف کی اس حدیث سے یہ استدلال کرتے ہیں حالانکہ اس میں صراحت موجود نہیں جس حدیث میں صراحت ہے اس میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ: ''فی اول قراۃ ولا فی اخرھا'' جس سے پھر ایک نیا موضوع شروع ہوجاتا ہے جو ''بسم اللہ'' جہر یا عدم جہر سے مختلف ایک تیسرا موضوع ہے کیا وہ صحیح مسلم کی اس حدیث کو نہیں پڑھتے جو استدلال میں پیش کردہ حدیث کے ساتھ ہی اگلی صاف اور صریح حدیث ہے۔اور اس میں دعائے استفتاح جہر پڑھنے کا حکم ہے۔حدیث یہ ہے:

عن عبدۃ ان عمر بن الخطاب کان یجھر بھولاء الکلمات یقول سبحنک اللھم وبحمدک وتبارک اسمک وتعالی جدک ولا الہ غیرک (صحیح مسلم جلد اول کتاب الصلوٰۃ)

عبدہ نے بیان کیا کہ حضرت فاروق اعظمؓ دعائے ثناء یعنی کلمات ذیل بلند آواز سے پڑھتے تھے۔ ''سبحنک اللھم وبحمدک وتبارک اسمک وتعالی جدک''۔

ہمارے جن بھائیوں نے ''بسم اللہ'' کو جہر کرنا ترک کیا انہوں نے ثناء کے ان الفاظ کو جہر پڑھنا شروع کر دیا ہے؟ اگر نہیں تو کیوں؟ کیا یہ حدیث صحیح مسلم کی نہیں ہے؟ کیا آپ کے نزدیک یہ حدیث صحیح نہیں ہے؟

صحیح مسلم کی ایک سے زیادہ احادیث ہیں جن میں ظہر وعصر اکٹھی پڑھنے کا ذکر ہے۔ایک حدیث درج ذیل ہے۔

عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال رسول اللہ ﷺ الظھر والعصر جمعیا بالمدینۃ فی غیر خوف ولا سفر

(جلد اول کتاب الصلوٰۃ)

عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ طیبہ میں ظہر اور عصر دونوں نمازوں کو ملا کر پڑھا۔ نہ تو کسی قسم کا وہاں خوف و ہراس تھا اور نہ ہی کوئی سفر درپیش تھا۔ صحیح مسلم میں تین آدمیوں کی صورت میں امام کا درمیان کھڑا ہونا اور دونوں مقتدیوں میں ایک دائیں اور دوسرے کا بائیں میں کھڑا ہونے کا حکم ہے کہ ابن مسعود نے دو آدمیوں کو جماعت کرائی تو ایک کو بائیں اور دوسرے کو دائیں کھڑا کیا اور خود درمیان میں کھڑے ہوئے پھر ایک حدیث میں رکوع کی حالت میں دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو جوڑ کر رانوں کے درمیان میں رکھنے کا ذکر بھی ہے۔ تشہد میں دایاں پاؤں بچھا کر بیٹھنے کا بھی ذکر ہے۔

ان پر عمل کیوں نہیں ہے؟ (صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ جلد اول)

ہمارے جو بھائی صحیح مسلم کی حدیث کی پیش نظر ''بسم اللہ'' جہر ترک کر بیٹھے ہیں کیا انہوں نے اپنے ہاں ظہر و عصر کو اکھٹا پڑھنا شروع کر دیا ہے؟ کیا وہ تین آدمی ہونے کی صورت میں امام کو درمیان میں کھڑا کرتے ہیں؟ کیا وہ رکوع کی حالت میں دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو جوڑ کر رانوں کے درمیان رکھ لیا کرتے ہیں؟ کیا وہ تشہد میں دایاں پاؤں بھی بچھا لیتے ہیں؟ کیا یہ احادیث صحیح مسلم کی نہیں ہے؟

بسم اللہ قرآن کریم کا افتتاحی کلمہ ہے اور یہاں کچھ محذوف بھی ہے:

10: قرآن مجید کا یہ افتتاحی فقرہ بجز ایک سورت کے ہر سورت کی ابتداء میں دہرایا گیا ہے یعنی 112 بار اور سورۃ نمل کے اندر عبارت میں بطور آیت قرآنی بھی آیا ہے اس لئے اس پر یہ بحث کرنا کہ آیا یہ قرآن کریم ہے یا نہیں؟ بالکل صحیح نہیں ہے اس لئے کہ یہ قرآن مجید کا جزو ہے۔ البتہ اس میں گفتگو کی جاسکتی ہے اور کی گئی ہے کہ آیا ہر سورت کی ابتداء میں بھی اس کی حیثیت ایک مستقل آیت کی ہے؟ بعض نے اس کو ہر سورۃ کی ایک مستقل آیت قرار دیا ہے اور بعض نے صرف دو سورتوں کے درمیان ایک امتیازی کلمہ قرار دیا ہے لیکن سورۃ فاتحہ میں تو یہ امتیاز بھی قائم نہیں ہوتا کیونکہ فاتحہ سے پہلے کوئی سورت موجود ہی نہیں جس کے اور فاتحہ کے درمیان اس کو ''بطور فصل'' تسلیم کیا جائے اس کی تفصیل دیکھنا منظور ہو تو ''الاتقان'' امام سیوطی اور ''احکام القرآن'' رازی کا مطالعہ کریں۔

یہاں آپ کی توجہ اس طرف مبذول کرائی جاتی ہے کہ ہر مکتبہ فکر اس بات کو تسلیم کرتا ہے اور کسی کو بھی اس میں اختلاف نہیں کہ قرآن مجید کی تلاوت شروع کرنے سے پہلے ''اعوذ باللہ'' کی تلاوت نہایت ضروری ہے وہ جہر پڑھی جائے یا دل میں پڑھ لی جائے دونوں طرح صحیح اور درست تسلیم کیا گیا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ پوری امت کا اسی پر عمل بھی موجود ہے لیکن اس کے باوجود قرآن مجید کو شروع کرتے وقت اور دو سورتوں کے درمیان کہیں بھی تعوذ کو نقل نہیں کیا گیا صرف تلقین کی جاتی ہے۔

حالانکہ قرآن کریم میں اس کا حکم بھی موجود ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے کہ: فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ ''کہ جب تو قرآن کو پڑھے تو اعوذ باللہ پڑھ لیا کر''۔ اس سلسلہ میں آپ ﷺ کا معلوم بھی یہی تھا کہ جب آپ ﷺ قرآن مجید کی تلاوت فرماتے تو تعوذ پڑھتے اور پڑھنے کا حکم فرماتے۔ قرآن مجید میں تعوذ کا حکم موجود ہونے کے باوجود کوئی شخص یہ نہیں کہتا کہ ''اعوذ باللہ'' قرآن مجید کا جزو ہے۔ لیکن اس کے برعکس قرآن مجید جب نبی کرم ﷺ کے سامنے تحریر کیا گیا تو آپ ﷺ نے حکماً بسم اللہ تحریر کرائی۔ صرف زبانی تلقین نہیں فرمائی۔

آپ ﷺ نے یہ حکم فرمایا کہ جب کوئی نیک کام شروع کرو تو ''بسم اللہ'' پڑھ لیا کرو۔ ہر جائز کام کی ابتداء ''بسم اللہ'' سے کرنے کی بڑی فضیلتیں حدیث میں وارد ہوئی ہیں۔ آپ ﷺ کی عادت مبارک بھی یہ تھی کہ کھانا کھاتے، پانی پیتے اور وضو کرتے غرض اس قسم کے سارے کاموں کی ابتداء بسم اللہ ہی سے کرتے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جو شخص کسی کام کو خدائے رحمٰن و رحیم کا نام لے کر شروع کرتا ہے وہ

عملاً اسی بات کا اعلان کرتا ہے کہ میرا ضمیر پاک وصاف ہے، میری نیت مخلصانہ ہے۔ میرا مقصود اعلیٰ ہے اور میں اللہ واحد کا پرستار ہوں۔ ایک طرف شرک سے اور دوسری طرف الحاد سے بیزار۔ غرض بسم اللہ سے بڑھ کر قوت بخش اور اس سے زیادہ روح واخلاق کو بلند کرنے والا ذکر کوئی اور نہیں ہے۔ ان سب جگہوں پر ''بسم اللہ'' کی حیثیت سنت کی ہے فرض کی نہیں۔

اکثر یہ کہا گیا ہے کہ بسم اللہ کی ''ب'' نحویوں کی اصطلاح میں باءالاستعانت کہلاتی ہے پڑھنے والا گویا یوں کہتا ہے کہ میں شروع کرتا ہوں اس کلام کو یا اس کام کو اللہ کے نام سے مدد چاہتے ہوئے اور یہ کہ بسم اللہ پڑھنے والا اپنی اور سب کی طرف سے قطع نظر کر کے صرف اللہ کی ذات پر تکیہ کر لیتا ہے۔ یہ مفہوم اپنی جگہ بالکل صحیح ہے اور ہر کام کو شروع کرتے وقت جو ''بسم اللہ'' پڑھی جاتی ہے اس کا یہی مفہوم لے کر پڑھنا چاہئے۔

یہاں ''بسم اللہ'' کو قرآن مجید کا جز و تسلیم کر کے جب ''بسم اللہ'' کی تلاوت کی جائے گی تو یقیناً اللہ کا وہ حکم آنکھوں کے سامنے آ جائے گا جب اللہ تعالیٰ نے اپنی رسول اللہ ﷺ کو وحی کی نعمت عظمیٰ سے نوازا اور حکم دیا کہ ''اقراء'' پڑھ۔ لہٰذا اس کو اگر یہاں بھی محذوف مانا جائے کہ ''اقراء بسم الله الرحمٰن الرحيم'' یعنی پڑھ اللہ کے نام سے جو بہت مہربان اور بہت پیار کرنے والا ہے۔ تو یہ ''محذوف'' بالکل وہی ہوگا جو خود اللہ تعالیٰ نے شروع وحی میں رسول اللہ ﷺ کو مخاطب فرما کر فرمایا: جیسا کہ سورۃ العلق میں ہے: '' اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ '' اپنے ربّ کے نام سے پڑھ۔ لہٰذا تلاوت قرآن مجید کے وقت جو بسم اللہ قرآن مجید کا جز و سمجھتے ہوئے تلاوت کی جائے گی تو اس کو مدنظر رکھنا زیادہ روح قرآنی کے قریب نظر آتا ہے ہم نے اس کے پیش نظر ترجمہ میں (پڑھو) کے لفظ کو تحریر کیا ہے جو ''اقراء'' کا اردو ترجمہ ہے۔

یہاں پر پہلی وحی کا مختصراً ذکر کیا جاتا ہے تفصیل اپنے موقع پر آئے گی۔ محدثین نے آغاز وحی کا قصہ اپنی اپنی سندوں کے ساتھ امام زہری سے اور انہوں نے عروہ بن زبیرؓ سے اور انہوں نے اپنی خالہ سیدہ عائشہ صدیقہؓ سے نقل کیا۔ وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ پر وحی کی ابتداء سچے اور بعض روایات کے مطابق اچھے خوابوں کی شکل میں ہوئی۔ آپ ﷺ جو خواب میں دیکھتے وہ ایسا ہوتا کہ آپ ﷺ نے دن کی روشنی میں دیکھا ہے پھر آپ ﷺ تنہائی پسند ہو گئے اور کئی کئی شب و روز غار حرا میں رہ کر عبادت کرنے لگے۔ (چونکہ ابھی تک اللہ کی طرف سے آپ ﷺ کو عبادت کا طریقہ نہیں بتایا گیا تھا) اس لئے یہ عبادت محض تدبر و تفکر فی الافاق تھا۔ آپ ﷺ کھانے پینے کا سامان گھر سے لے جا کر وہاں چند روز گزارتے اور پھر حضرت خدیجہؓ کے پاس واپس آتے اور آپ ﷺ کے تقاضا کے مطابق وہ مزید چند روز کے لئے سامان آپ ﷺ کے لئے مہیا کر دیتی تھیں۔ ایک روز جب آپ ﷺ غار حرا میں تھے یکایک آپ ﷺ پر وحی نازل ہوئی اور فرشتے نے کوئی تحریر کی ہوئی چیز آپ ﷺ کے سامنے پیش کی۔ اور کہا کہ اس کو پڑھو۔ اس کے بعد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نبی کریم ﷺ کا قول نقل کرتی ہیں کہ: ''میں نے کہا میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں'' اس پر فرشتہ نے مجھے پکڑ کر بھینچا یہاں تک کہ میری قوت جواب دینے لگی اور پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا پڑھو۔ میں نے کہا میں تو پڑھا ہوا نہیں اس طرح تین بار ہوا اور تیسری بار اس نے بھینچا اور ساتھ ہی کہا۔ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۚ (پڑھو اپنے ربّ کے نام سے جس نے تمہیں پیدا کیا یہاں تک کہ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝ تک پہنچ گیا۔

ازیں بعد آپ ﷺ پر کپکپی طاری ہو گئی اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کانپتے لرزتے ہوئے وہاں سے واپس آئے۔ حضرت خدیجہؓ سے آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے اوڑھا دو۔ چنانچہ خدیجہؓ نے کپڑا اوڑھا دیا۔ جب آپ ﷺ کی کپکپی دور ہوئی۔ تو آپ ﷺ نے سارا واقعہ خدیجہؓ سے بیان کیا، نہ معلوم خدیجہ کیا ہونے والا ہے؟ اس باہمت خاتون نے کہا۔ ہرگز نہیں آپ ﷺ خوش ہو جائیے خدا کی قسم آپ ﷺ کو اللہ کبھی ضائع نہیں کرے گا۔ آپ ﷺ رشتے داروں سے نیک سلوک کرتے ہیں۔ سچ بولتے ہیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ﴿۲﴾

ہر طرح کی اچھی (11) تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جو تمام کائنات (12) خلقت کا پروردگار (13) ہے (14)۔2

امانتیں ادا کرتے ہیں۔ مہمان نوازی کرتے ہیں۔ آپ ﷺ بے سہارا لوگوں کا سہارا ہیں ناداروں کو دینے والے ہیں اور نیک کام پر ان کی مدد کرتے ہیں۔ آپ ﷺ کو اللہ نہیں چھوڑے گا نبی رحمت ﷺ نے کپڑا اڑھا دو کے الفاظ کہہ کر گویا اس خاتون اول کے دل کو حاصل کر لیا جو اس راہ کی ساری مشکلوں کا صحیح حل تھا۔ رسول اللہ ﷺ کو کوئی خوف وڈر نہیں تھا کہ میرے ساتھ کیا ہوگا ساری فکر بس یہی تھی کہ اس بار گراں کے بعد گھر والوں کا کیا ہوگا۔ جو میری کفالت میں ہیں ان کا کیا بنے گا اور یہ انسانی فطرت کے تقاضے ہیں اور ان سب انسانی تقاضوں کا آپ ﷺ نے ایک جملہ میں ایسا نہ ٹوٹنے والا حل تلاش کیا جس میں آپ ﷺ کی کامیابی کا اصل راز تھا کہ گھر کا نظام چلتا رہے۔

افسوس اس بات کو اہل اسلام کے بعض ناقدر شناس لوگوں نے اس جملہ پر طرح طرح کے اعتراض کئے ہیں جن میں ایک اعتراض بھی ان کا معقول نظر نہیں آتا اور حالات وواقعات نے ثابت بھی کر دیا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی فراست نے جو فیصلہ کیا۔ مشیت ایزدی نے اس فیصلہ کو قومی ترقی کا زینہ قرار دیا علاوہ ازیں بھی اس پر گفتگو کی گئی ہے لیکن جگہ کی قلت مانع ہے اور اس طرح ہم اصل مضمون سے دور نکل جائیں گے۔

اس کا موقع آئے گا تو مزید گفتگو ہوگی۔ ان شاء اللہ!

تمام خوبیوں کا مالک صرف اللہ ہی ہے:

11: ''الحمد'' کی ''اصل'' ح م د ہے۔ الحمد للہ کے معنی اللہ تعالیٰ کی فضلیت کے ساتھ اس کی ثناء بیان کرنے کے ہیں۔ یہ مدح سے خاص اور شکر سے عام ہے۔ سب خوبیاں اور ستائشیں اللہ ہی کے لئے ہیں۔

''الحمد'' کا لفظ قرآن مجید میں 28 بار اور ''الحمد للہ'' 23 بار آیا ہے۔ الحمد للہ ربّ العالمین کا پورا جملہ (فاتحہ ۱:۲) (الانعام ۶:۴۵) (یونس (۱۰:۱۰) (الصافات ۳۷:۱۸۲) (الزم ۳۹:۷۵) (المومن ۴۰:۶۵) یعنی کل چھ بار استعمال ہوا ہے۔ الحمد للہ ربّ العالمین فاتحہ کی دوسری آیت ہے۔

لفظ عالمین کی تحقیق لغت میں:

12: ''العالمین'' کی ''اصل'' ع ل م ہے۔ امام راغب مفردات القرآن میں رقمطراز ہیں "عالم" آسمان اور آسمان کے نیچے جو جواہر واعراض ہیں ان سب کا نام ہے۔ یہ اصل میں اسم ہے اس چیز کا جس کے ذریعے علم حاصل کیا جائے۔ جس طرح سے طابع (ٹھپہ) اور خاتم (مُہر) ان اشیاء کے اسم ہیں جن سے ٹھپہ لگایا جاتا ہے اور مہر کی جاتی ہے اور اس صغیہ پر اس کی بناء بھی اس لیے رکھی گئی ہے کہ وہ بھی بمنزلہ آلہ کے ہے کیونکہ عالم اپنے بنانے والے کی طرف رہنمائی کا آلہ ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت کی معرفت کے سلسلہ میں ہم کو عالم ہی کا حوالہ دیا ہے۔ جیسے ارشاد ہے: اَوَ لَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ اور اس کی جمع بھی اس لحاظ سے ہے کہ ان مخلوقات کی ہر نوع ''عالم'' کہلاتی ہے چنانچہ کہا جاتا ہے عالم انسان، عالم آب، عالم آتش نیز کہا گیا ہے کہ حق تعالیٰ کے ''دہ وچند ہزار عالم'' ہیں اور جمع سالم کی وجہ یہ ہے کہ انسان بھی ان عالموں کے زمرہ میں شامل ہے اور جب کسی لفظ کا استعمال انسان اور غیر انسان دونوں کے لئے مشترک ہو تو انسان کا حکم غالب ہوتا ہے اور اس میں اور بھی اقوال پائے جاتے ہیں جن کی

بحث بہت لمبی ہے۔

عالم جاننے والا، علم رکھنے والا، علم سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر۔ قرآن کریم میں اس لفظ کا استعمال جہاں حق تعالیٰ کی ذات عالی کے لئے خاص ہے وہاں اس کے معنی ہیں ''وہ ذات عالی کہ جس پر کوئی چیز مخفی نہ ہو اور وہ ہر چیز کی حقیقت سے باخبر ہو۔ امام راغب کہتے ہیں: والعالم فی وصف اللہ ھو الذی لا یخفی علیہ شئی و ذلک لا یصح الا فی وصفہ تعالی۔

''عالم جب اللہ تعالیٰ کا وصف ہو تو اس کے معنی ہیں وہ ذات جس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں اور یہ بات صرف اللہ تعالیٰ ہی کے وصف میں صحیح ہے۔''

ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف راہنمائی کرنے والا کون ہے؟

13: ''رب'' کی ''اصل'' رب ب ہے اور ربّ کے معانی ہیں پروردگار۔ مالک، صاحب۔ یہ اصل میں "ربّ یربّ" کا مصدر ہے جس کے معنی ترتیب کے ہیں اور پھر مبالغہ کے لئے "عدل" کی طرح بطور صفت استعمال کیا گیا ہے۔ امام راغب کہتے ہیں کہ ربّ مصدر ہے جو فاعل کے لئے مستعار ہے۔ ترتیب کی تعریف امام موصوف نے ان الفاظ میں کی ہے: ''ھو انشاء الشئی حالا فحالا الی حد التمام'' یعنی کسی چیز کو یکے بعد دیگرے ایک حالت سے دوسری حالت میں اس طرح نشوونما دیتے رہنا کہ حد کمال تک پہنچ جائے۔ ''ربّ العالمین'' میں ربّ اللہ تعالیٰ کی صفت خاص کے طور پر بیان کی گئی ہے اور ربّ العالمین کا لفظ 73 بار قرآن کریم میں آیا ہے۔

''رب'' کا لفظ قرآن مجید میں 84 بار آیا ہے اور ''رب جو دراصل ربی ہے 68 بار استعمال ہوا ہے اور واضح طور پر ''ربی'' کا لفظ 101 بار استعمال ہوا ہے ''رب'' جیسے ''الحمدللہ ربّ العٰلمین'' (فاتحہ ۱:۲)

''رب'' جیسے: وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا (البقرۃ ۲:۱۲۶) ''ربی'' جیسے: اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ (البقرۃ ۲:۲۵۸)

طلب کرنے اور مانگنے کے آداب لفظ ''حمد'' صرف اللہ ہی کے لیے ہے:

14: عربی زبان میں ''حمد'' ستائش ثنائے جمیل کو کہتے ہیں جس کا عام مفہوم ہے اچھی صفتیں، اکثر اردو مترجمین نے اس کے معنی تعریف یا صفت کے کئے ہیں۔ لیکن تعریف یا صفت میں دونوں مفہوم پائے جاتے ہیں کیونکہ تعریف یا صفت اچھی بھی ہوتی ہے اور بری بھی۔ لیکن تعریف یا صفت میں دونوں مفہوم پائے جاتے ہیں کیونکہ تعریف یا صفت اچھی بھی ہوتی ہے اور بری بھی۔ لیکن عربی زبان میں ہر صفت یا ہر تعریف کو ''حمد'' نہیں کہا جاسکتا۔ اس لئے صحیح معنی یہی ہوں گے کہ ''اچھی تعریفیں'' یا اچھی صفتیں ''الحمد'' پر الف لام استغراق کے لئے بھی ہوسکتا ہے اور جنس کے لیے بھی۔ پس ''الحمدللہ'' کے معنی ہوئے کہ حمد و ثناء میں سے جو کچھ بھی کہا جاسکتا ہے وہ سب کا سب اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے کیونکہ خوبیوں اور کمالات میں سے جو کچھ بھی ہے صرف اور صرف اس سے ہے اور اسی میں ہے۔

''حمد'' سے سورت کی ابتداء کیوں کی گئی؟ اس لئے کہ مغفرت الٰہی کی راہ میں انسان کا سب سے پہلا تاثر یہی ہے۔ جب کبھی بھی ایک سچا انسان اس راہ میں قدم اٹھائے گا تو سب سے پہلے جو حالت اس کی فکر پر طاری ہوگی وہ قدرتی طور پر یہی ہوگی جسے اس جگہ تحمید و ستائش سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ انسان کے لئے معرفت حق کی راہ کیا ہے؟ سو قرآن مجید اس کے متعلق کہتا ہے کہ وہ صرف ایک ہی راہ ہے اور وہ ہے کائنات خلقت میں تدبر و تفکر۔ اس لئے کہ مصنوعات کا مطالعہ انسان کو صانع حقیقی تک پہنچا دے گا چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَ يَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ (آل عمران ۳:۱۹۱)

''جو لوگ اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے ہر حال میں اللہ تعالیٰ کو یاد کیا کرتے ہیں اور زمین و آسمان کی ساخت میں غور و فکر کرتے ہیں وہ بے اختیار یوں پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! یہ کارخانہ عالم تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا''۔

اس غور و فکر کا سب سے پہلا اثر جو اس کے دل و دماغ پر طاری ہوگا وہ کیا ہوگا؟ یہی کہ وہ دیکھے گا کہ خود اس کا وجود اور اس کے وجود سے باہر کی ہر چیز ایک مدبر قدیر اور صانع حکیم کی کارفرمائیوں کی جلوہ گاہ ہے۔ پس قدرتی طور پر اس کی روح جوش ستائش اور محویت جمال سے معمور ہو جائے گی اور وہ بے اختیار کہہ اٹھے گا کہ ''الحمد للہ'' ساری حمد و ستائش اسی کے لئے ہے جو معنی حسن و کمال ہے۔ ''سبحان اللہ والحمد للہ''۔

مزید غور کرو گے تو معلوم ہوگا کہ اس راہ میں فکر انسانی کی سب سے بڑی گمراہی یہی ہے کہ اس کی نظریں مصنوعات کے جلووں میں محو ہو کر رہ جاتی ہیں اور آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کرتیں۔ وہ پردوں کے نقش و نگار دیکھ کر بے خود ہو جاتا ہے اور اس ذات کی جستجو نہیں کرتا جس نے اپنے جمال صفت پر یہ دلآویز پردے ڈال رکھے ہیں۔ دنیا میں مظاہر فطرت کی پرستش کی بنیاد اس کوتاہ نظری سے پڑی ہے اور ''الحمد للہ'' کا اعتراف دراصل اسی حقیقت کا اعتراف ہے کہ کائنات کا تمام جمال خواہ کسی گوشے میں ہو صرف ایک صانع حقیقی کی صفتوں ہی کا ظہور ہے۔ اب کون ہے جو جمال کو اچھی صفت سے تعبیر نہیں کرے گا؟

نزول قرآن سے قبل ''اللہ'' کا لفظ خدا کے لئے بطور اسم ذات مستعمل تھا۔ قرآن مجید نے بھی یہی لفظ بطور اسم ذات اختیار کیا اور تمام صفتوں کو اس کی طرف نسبت دی چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۪ (الاعراف ۷:۱۸۰)

''اور اللہ تعالیٰ کے نام یعنی صفات بہت حسین و جمیل ہیں لہٰذا تم اس کو اس کے اسمائے حسنیٰ ''یعنی صفتوں میں سے جس صفت سے چاہو پکار سکتے ہو''۔

قرآن مجید نے یہ لفظ محض اس لئے اختیار نہیں کیا کہ لغت کے مطابقت کا مقتضی ہے بلکہ اس سے زیادہ اس میں اس کی معنوی موزونیت پوشیدہ ہے کیونکہ جب ہم اس کی معنوی حقیقت پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس غرض کے لئے سب سے زیادہ موزوں لفظ یہی تھا۔

دنیا کی تمام قوموں کی زبانوں میں جن کا حال کچھ بھی اس صفحہ قرطاس میں منقول ہے یعنی طہرانی، سریانی، آرامی، کلدانی، حمیری اور عربی وغیرہ، سب میں اس کا یہ لغوی خاصہ پایا جاتا ہے۔ یہ الف، لام اور ہاء کا مادہ ہے جیسا کہ لغات میں موجود ہے اور بلاشبہ اس کی اصل ''الٰہ'' ہے اور تمام لغات متفق ہیں کہ ''الٰہ'' کے معنی تحیر اور درماندگی کے ہیں۔ پس خالق کائنات کے لیے یہ لفظ اس لئے اسم قرار پایا کہ اس کے متعلق جو کچھ انسان جانتا ہے یا جان سکتا ہے وہ عقل کے تحیر اور درماندگی کے سوا کچھ نہیں۔ آپ جس قدر بھی اس ذات مطلق کی ہستی میں غور و خوض کریں گے آپ کی عقل کی حیرانی اور درماندگی یقیناً بڑھتی ہی جائے گی یہاں تک کہ آپ جو نتیجہ اخذ کریں گے وہ یہی ہوگا کہ اس راہ کی ابتداء بھی عجز و حیرت سے ہوتی ہے اور انتہا بھی عجز و حیرت ہی ہے۔

خدا کو اس کی صفتوں سے پکارنا ہے تو بلاشبہ اس کی صفتیں بے شمار ہیں۔ لیکن اگر صفات سے الگ ہو کر اس کی ذات کی طرف اشارہ کرنا ہے تو وہ اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ وہ ایک متحیر کر دینے والی ذات ہے اور جو کچھ اس کی نسبت سے کہا جا سکتا ہے وہ عجز و درماندگی کے اعتراف کے سوا کچھ نہیں ہے۔

چونکہ ''اللہ'' کا اسم خدا کے لئے بطور اسم ذات استعمال میں آیا اس لئے قدرتی طور پر ان تمام صفتوں پر حاوی ہو گیا۔ اگر ہم خدا کا تصور اس کی کسی صفت کے ساتھ کریں مثلاً ''الرب'' ''الرحمٰن'' ''الرحیم'' تو یہ تصور صرف ایک خاص صفت ہی میں محدود ہوگا۔ یعنی وہ ذات جس میں ربوبیت یا رحمت ہے لیکن جب ہم ''اللہ'' کا لفظ زبان پر لاتے ہیں تو فوراً ہمارا ذہن ایک ایسی ہستی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو ان تمام صفات حسن و کمال سے متصف ہے جو اس کی نسبت بیان کی جا سکتی ہے۔

؎ اے بروں از وہم و قال و قیل من۔ خاک بر فرق من و تمثیل من!

''الحمد'' کی ایک تقریر یہ ہے کہ ''الحمد'' میں الف لام استغراق کے لئے نہیں بلکہ جنس اور عہد خارجی کے لئے ہے اور قاعدہ نحو کے مطابق الف لام کا حقیقی معنی ہے ہی جنس اور عہد خارجی۔ استغراق کو محققین نے الف لام کا مجازی محمل قرار دیا ہے اور اس سے صرف وہی صفات مراد ہیں جو ذات باری تعالیٰ کے ساتھ مختص ہیں، اور وہ مخلوق میں نہیں پائی جاتیں۔ یعنی صفات کارسازی یا بالفاظ دیگر صفات فاعلیہ یا صفات مافوق الاسباب مثلاً مالک و مختار، متصرف و کارساز، حاجت روا، مشکل کشا اور دور و نزدیک سے یکساں طور پر سمیع و بصیر وغیرہ مطلب یہ ہے کہ تمام صفات الوہیت اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہیں اور ان میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ مثلاً قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے جا بجا اپنی صفات الوہیت بیان فرمائی ہیں چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے:

1: قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ؕ (النمل ۲۷:۶۵)

''اے پیغمبر! ﷺ'' ''آپ ﷺ انہیں کہہ دیں کہ زمین و آسمان کی ساری موجودات (جنّ و انس اور فرشتوں) میں سے کوئی بھی غیب کا علم نہیں رکھتا، غیب کا علم صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی صفت علم غیب کا ذکر ہے اور یہ صفت ''''صفات الوہیت'' میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ ہی کے لئے خاص ہے اور غیر اللہ میں یہ صفت نہیں ہوگی اور جو شخص یہ صفت غیر اللہ میں تصور کرے گا وہ گویا شرک کرے گا۔

2: وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ؕ (یونس ۱۰:۱۰۷)

''اور اگر وہ ''اللہ تعالیٰ'' اپنے قانون کے مطابق آپ کو کسی بیماری، فقر و فاقہ یا کسی مصیبت میں مبتلا کر دے تو دوسرا اس کے سوا کون ہے جو اس سے نجات دے سکے اور اگر وہ اپنے قانون کے مطابق تمہیں صحت، توانائی، تونگری اور بھلائی دینے کا ارادہ رکھتا ہو تو اس کے فضل و کرم کو ٹالنے والا بھی کوئی نہیں ہے''۔

اس میں واضح فرمایا کہ نفع و نقصان کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ''نفع و نقصان'' پہنچانے کی صفت الوہیت کے متعلق ہے اگر کسی نے غیر اللہ کو نفع و نقصان کا مالک متصور کیا تو گویا اس نے الوہیت کی خاص صفت میں کسی دوسرے کو شریک کر دیا اور یہی شرک ہے۔

ایک جگہ ارشاد ہے:

3: وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ (نحل ۱۶: ۵۳) ''دنیا میں جو نعمت بھی تم میں سے کسی کو ملتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی بخشش اور اس کی عطا کردہ ہے''۔

اللہ تعالیٰ کی ساری مخلوق پر صبح و شام مختلف انعامات کی جو بارش ہوتی رہتی ہے وہ سب اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے اور اس ''نعمت'' کے عطا کرنے کے صفت میں اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں ہے کیونکہ یہ صفت بھی خاص الوہیت کے متعلق ہے۔

ایک جگہ ارشاد خداوندی ہے:

4: يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ؕ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۔

(فاطر ۳۵:۳)

''اے بنی نوع انسان! اللہ تعالیٰ نے جو انعامات اور احسانات تم پر کئے ہیں انہیں فراموش نہ کرو وہ تمہیں عدم سے وجود میں لایا اور تمہارے لئے آسمان سے بارانِ رحمت برسا کر زمین سے تمہیں رزق بہم پہنچایا، اس کے سوا اور کوئی ہے جو تمہیں یہ سب کچھ دے سکے؟''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے خالق و رازق اور منعم و مربی ہونے کی صفات کا ذکر فرمایا ہے اور یہ صفات ''الوہیت'' کے متعلق خاص ہیں ان کو کسی دوسری ہستی میں تسلیم کرنا اللہ تعالیٰ کی صفات میں شریک کرنا ہے جو ایک کھلا شرک ہے۔

علاوہ ازیں سینکڑوں آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی صفات مخصومہ بیان کی گئی ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات جو ''الوہیت'' سے متعلق ہیں اسی کے لیے خاص ہیں اور وہ سب مافوق الاسباب ہیں۔ یہاں یہ بات سمجھ لی جائے کہ نظام عالم میں جو کام ہو رہے ہیں وہ دو حالتوں سے خالی نہیں یا تو وہ ماتحت الاسباب ہیں مثلاً بینائی اور شنوائی رکھنے والا آدمی اپنے اردگرد کی چیز دیکھ سکتا ہے اور قرب و جوار کی آوازیں سُن سکتا ہے یا مثلاً ایک آدمی اناج یا پھل اُگانا چاہتا ہے تو وہ اس کام کے لئے اسباب استعمال کرتا ہے یعنی زمین میں ہل چلاتا ہے اور اس کو اس قابل بناتا ہے کہ اس میں کاشتکاری ہو سکے پھر اس میں بیج ڈالتا ہے، اسے پانی دیتا ہے اس کی نلائی وغیرہ کرتا ہے یہ تمام اسباب عادیہ ہیں ان کو استعمال میں لائے بغیر کام نہیں بن سکتا۔ دوسری قسم کے کام وہ ہیں، جو مافوق الاسباب ہیں مثلاً: ساری کائنات کے ذرّے کو ہر وقت دیکھنا۔ زمین و آسمان کی چھپی ہوئی تمام چیزوں کا ہر آن مشاہدہ کرنا۔ اسباب عادیہ سے بالاتر اور ماوراء ہے۔ اسی طرح زمین کے پیٹ میں پڑے بیجوں، تخموں اور گٹھلیوں کو شق کر کے ان پودوں کی شاخیں نکالنا انسانی دسترس سے باہر اور اسباب عادیہ سے بالاتر ہے تو معلوم ہوا کہ انسانی دسترس میں صرف وہی کام ہیں جو ماتحت الاسباب ہیں اور مافوق الاسباب سارے امور صرف اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت کے تحت داخل ہیں۔

''الحمدُ'' سے مراد وہ تمام صفات ہیں جو مافوق الاسباب ہیں یعنی مافوق الاسباب تمام اچھی صفتیں اور خوبیاں اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہیں اور ان میں سے ایک صفت اور خوبی بھی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور میں نہیں پائی جاتی مشرکین مکہ چونکہ انہی صفات الوہیت یا مافوق الاسباب صفات ہی میں اپنے معبودوں کو خدا کا شریک سمجھتے تھے اس لئے ''الحمدللہ'' میں مشرکین کے اس خیال باطل کی تردید اس طرح فرمائی گئی ہے کہ تمام مافوق الاسباب صفات اللہ تعالیٰ ہی کے لئے خاص ہیں۔ ان شاء اللہ جوں جوں قرآن مجید کا مطالعہ کریں گے یہ بات روزِ روشن کی طرح صاف سامنے آتی جائے گی۔

مختصر یہ کہ سورہء فاتحہ میں ''الحمدللہ'' ایک دعویٰ ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ تمام صفات کارسازی کا مستحق صرف اللہ ہے۔ اور اس کے بعد ربّ العالمین، الرحمٰن الرحیم اور مالک یوم الدین، یہ سب اس دعویٰ کی دلیلیں ہیں۔

''رب'' بھی ''الٰہ'' کی طرح عالمی قومی زبانوں کا ایک کثیر الاستعمال لفظ ہے۔ عبرانی، سریانی اور عربی تینوں زبانوں میں اس کے معنی پانے والے ہی کے ہیں چونکہ پرورش کی ضرورت کا احساس انسانی زندگی کے بنیادی احساسات میں سے ہے اس لئے اسے بھی قدیم ترین تعبیرات سے سمجھنا چاہیے۔ چونکہ والدین، معلم، استاد اور آقا کسی نہ کسی اعتبار سے پرورش کرنے والے ہوتے ہیں اس لئے اس کا اطلاق ان معنوں میں بھی ہونے لگا۔ چونکہ عبرانی اور آدامی کا لفظ ''ربی'' اور ''رباہ'' پرورش کنندہ معلم اور آقا تینوں معنی رکھتا تھا اور اسی طرح قدیم مصری اور کلدانی زبان کا ایک لفظ ''رابو'' بھی انہی معنوں میں مستعمل ہوتا تھا اور اس سے ان ملکوں کی قدیم ترین وحدت کی خبر ملتی ہے۔

بہرحال عربی میں بھی ''ربوبیت'' کے معنی پالنے والے کے ہیں لیکن دوسری زبانوں کی نسبت عربی میں اس کو وسیع اور کامل معنوں میں

بولا جاتا ہے اس لئے بعض ائمہ لغت نے اس کی تعریف ان لفظوں میں کی ہے:

''ھو انشاء الشئی حالا فحالا الی حد التمام'' ۔(مفردات راغب اصفہانی، مادہ ربّ ب)

یعنی کسی چیز کو یکے بعد دیگرے اس کی مختلف حالتوں اور ضرورتوں کے مطابق اس طرح نشوونما دیتے رہنا کہ وہ چیز اپنے حد کمال کو پہنچ جائے۔ اگر کوئی شخص بھوکے کو کھانا کھلا دے یا محتاج کو پیسہ دے دے تو یہ اس کا کرم ہوگا، جود ہوگا، احسان ہوگا لیکن وہ بات نہ ہوگی جسے ربوبیت کہتے ہیں۔ ربوبیت کے لئے ضروری ہے کہ پرورش اور نگہداشت کا ایک جاری اور مسلسل اہتمام ہو اور ایک وجود کو اپنی طبعی حالت کے مطابق وقتاً فوقتاً جیسی ضرورتیں پیش آتی ہیں ان سب کا سروسامان اس انداز کے ساتھ ہوتا رہے کہ یہ سب کچھ ایک خاص محبت اور شفقت کے ساتھ ہوتا نظر آئے۔ کیونکہ جو عمل محبت وشفقت سے خالی ہوگا وہ ربوبیت نہیں ہوسکتی۔

ربوبیت میں ایک ناقص ترین نمونہ ہم پرورش میں دیکھ سکتے ہیں جس کا جوش ماں کی فطرت میں ودیعت کر دیا گیا ہے۔ دیکھو بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو محض ایک گوشت و پوست کا متحرک لوتھڑا ہوتا ہے اور زندگی اور نمو کی جتنی قوتیں بھی رکھتا ہے وہ سب کی سب پرورش وتربیت کی محتاج ہوتی ہیں۔ یہ پرورش محبت وشفقت، حفاظت ونگہداشت اور بخشش واعانت کا ایک طویل ترین سلسلہ ہے اور اسے اس وقت تک جاری رہنا چاہیے جب تک بچہ اپنے جسم وذہن کے حد بلوغ تک نہ پہنچ جائے۔ پھر پرورش کی ضرورتیں ایک دو نہیں بے شمار ہیں اور ان کی نوعیت بھی ہمیشہ بدلتی رہتی ہے اور ضروری ہے کہ ہر عمر اور ہر حالت کے مطابق محبت کا جوش، نگرانی کی نگاہ اور زندگی کے سروسامان ملتا رہے۔ حکمت الٰہی نے ماں کی محبت میں ربوبیت کے یہ تمام خدوخال پیدا کر دیئے ہیں یہ ماں کی ربوبیت ہے جو پیدائش کے دن سے لے کر بلوغ تک بچہ کو پالتی ہے، بچاتی اور سنبھالتی رہتی ہے اور ہر وقت اور ہر حال کے مطابق اس کی ضروریات پرورش کا سروسامان مہیا کرتی رہتی ہے۔

جب بچہ کا معدہ دودھ کے سوا کسی غذا کا متحمل نہ تھا تو اسے دودھ ہی پلایا جاتا رہا۔ جب دودھ سے زیادہ قوی غذا کی ضرورت ہوئی تو ویسی ہی غذا دی جانے لگی۔ جب اس کے پاؤں میں کھڑے ہونے کی سکت نہ تھی تو ماں اسے گود میں اٹھائے پھرتی تھی، جب کھڑے ہونے کے قابل ہوا تو انگلی پکڑ لی اور ایک ایک قدم چلانے لگی۔ پس ہر حالت وضرورت کے مطابق ضروریات مہیا ہوتی رہیں اور نگرانی وحفاظت کا ایک مسلسل اہتمام جاری رہا۔ یہ صورتحال ہے جس سے ربوبیت کے مفہوم کا تصور کیا جاسکتا ہے۔

ایک بار پھر غور کرو کہ جو چیز کسی انسان کے لئے باعث تکلیف ہوتی ہے اس سے نفرت ہونا لازمی ولابدی امر ہے کائنات ہستی میں اس کی ایک مثال بھی نہیں دی جاسکتی کہ جو شئے جان جیسی چیز کے لئے خطرے کا باعث ہو وہ ان سارے خطرات اور باعث ایذا ہونے کے باوجود پھر جان ہی سے زیادہ عزیز بھی ہوجائے یہ صرف ایک ماں کی مامتا ہے کہ وہ جان کی بازی لگا کر بچے کو جنم دیتی ہے اور وضع ورضع کی جانکاہ تکالیف برداشت کرنے کے باوجود اس بچہ کو جو اس کے لئے باعث ایذا ہوا، پھر اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتی ہے۔

مجازی ربوبیت کی یہ ناقص اور محدود مثال سامنے لاؤ اور ربوبیت الٰہی کو غیر محدود حقیقت کا تصور کرو۔ اللہ تعالیٰ کے ''ربّ العٰلمین'' ہونے کے یہ معنی ہوئے کہ جس طرح اس کی خالقیت نے کائنات اور اس کر ہر چیز کو پیدا کیا ہے اسی طرح اس کی ربوبیت نے ہر مخلوق کی پرورش کا سروسامان بھی کر دیا ہے اور یہ پرورش کا سروسامان ایک ایسے عجیب وغریب نظام کے ساتھ ہے کہ ہر وجود کو زندگی اور بقا کے لئے جو کچھ مطلوب تھا وہ کچھ مل رہا ہے۔

دور نہ جاؤ ایک بار پھر ربوبیت الٰہی کی کارسازی پر غور کرو کہ کس طرح ماں کی فطرت میں بچے کی محبت ودیعت کر دی گئی اور کس طرح اس جذبے کو طبیعت بشری کے تمام جذبات میں سب سے زیادہ پُرجوش اور سب سے زیادہ ناقابل تسخیر بنا دیا گیا ہے؟ دنیا کی کونسی طاقت ہے جو اس جوش کا مقابلہ کرسکتی ہے جسے ماں کی مامتا کہتے ہیں۔ جس بچے کی پیدائش اس کے لئے زندگی کی سب سے بڑی مصیبت تھی، جس کے

متعلق ربّ ذوالجلال نے یوں وضاحت فرمائی ہے:

حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّ وَضَعَتْهُ كُرْهًا ؕ (۱۵:۴۶)

''اس کی ماں نے اس کو تکلیف کے ساتھ پیٹ میں رکھا اور تکلیف کے ساتھ جنا۔''

اس کی محبت اس کے اندر زندگی کا سب سے بڑا جذبہ مشتعل کر دیتی ہے۔ جب تک بچہ سن رشد تک نہیں پہنچ جاتا وہ اپنے لئے نہیں بلکہ بچے کے لیے زندہ رہنا چاہتی ہے۔ زندگی کی کوئی خود فراموشی نہیں جو اس پر طاری نہ ہوتی ہو اور راحت و آسائش کی کوئی قربانی نہیں جس سے اسے گزیر ہو۔ جب ذات جو فطرت انسانی کا سب سے زیادہ طاقتور جذبہ ہے اور جس کے انفعالات کے بغیر کوئی مخلوق زندہ نہیں رہ سکتی وہ بھی اسی جذبہ خود فراموشی کے مقابلہ میں مضمحل ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ بات کہ ایک ماں نے بچے کے عشق میں اپنی زندگی قربان کر دی فطرت مادی کا ایک ایسا معمولی واقعہ ہے جو ہمیشہ پیش آتا رہا ہے اور ہم اس میں کسی طرح کی غرابت محسوس نہیں کرتے۔

غور طلب یہ ہے کہ ایک ماں میں یہ محبت کیوں رکھی گئی؟ اس لئے کہ اس کے بچے کو پرورش کی احتیاج تھی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں ہر چیز ایسی ہے کہ اسے پرورش کی احتیاج ہے اور اسے پرورش مل رہی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ کوئی پرورش کرنے والا بھی موجود ہو۔ یہ پرورش کرنے والا کون ہے؟ یقیناً وہ نہیں ہو سکتا جو خود پروردہ اور محتاج پروردگاری ہو۔ قرآن مجید اس کے متعلق ہمیں بتاتا ہے کہ وہی ''ربّ العٰلمین'' ہے۔ جو سب کا پرورش کرنے والا ہے لیکن اس کا کوئی پرورش کرنے والا نہیں۔

نظام ربوبیت میں ہر ایک چیز کی پرورش و نگرانی داخل ہے لیکن انسان چونکہ ہر ایک سے افضل و اعلیٰ ہے اس لئے انسان کا ذکر مخصوص کر دیا گیا اس طرح انسانوں کو باور کرایا کہ یاد رکھو تمام انسانوں کا پیدا کرنے والا اللہ ہی ہے۔ نطفہ سے لے کر طفولیت تک اور طفولیت سے لے کر بڑھاپے تک تمام منازل سے انسان کو وہی گزارتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے نہایت اختصار سے اس حقیقت کو بیان فرمایا:

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضَعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضَعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضَعْفًا وَّ شَیْبَةً ؕ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ۚ وَ هُوَ الْعَلِیْمُ الْقَدِیْرُ ﴿۵۴﴾ (روم ۳۰:۵۴)

''وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہیں ایک حقیر سی بوند سے ضعف کی حالت میں پیدا کیا پھر اس ضعف اور کمزوری کے بعد قوّت و توانائی بخشی پھر اس قوت و توانائی کے بعد ضعف اور کمزور کر کے بوڑھا کر دیا وہ ہر چیز پر پوری اور کامل قدرت رکھتا ہے''۔

پھر انسانوں اور دوسری تمام اجناس کو پیدا کر کے چھوڑ نہیں دیا بلکہ انسان اور دوسرے تمام حیوانات کے لئے اللہ تعالیٰ کس طرح روزی بھی بہم پہنچاتا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

فَلْیَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰی طَعَامِهٖۤ ﴿۲۴﴾ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ﴿۲۵﴾ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ﴿۲۶﴾ فَاَنْۢبَتْنَا فِیْهَا حَبًّا ﴿۲۷﴾ وَّ عِنَبًا وَّ قَضْبًا ﴿۲۸﴾ وَّ زَیْتُوْنًا وَّ نَخْلًا ﴿۲۹﴾ وَّ حَدَآىِٕقَ غُلْبًا ﴿۳۰﴾ وَّ فَاكِهَةً وَّ اَبًّا ﴿۳۱﴾ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَ لِاَنْعَامِكُمْ ﴿۳۲﴾ (عبس ۸۰:۲۴ تا ۳۲)

''پھر اے انسان ذرا اپنی خوراک پر تو غور کر کس طرح ہم نے اپنی قدرت سے مہیا کر دی کہ پہلے تو آسمان سے موسلا دھار بارش برسائی پھر زمین کو عجب طریقے سے پھاڑ دیا۔ پھر اس میں غلہ جات اگائے، انگور اور ترکاریاں پیدا کیں، زیتون کے درخت اور کھجور کے جھنڈ پیدا کئے اور گھنے باغات اگائے اور قسم قسم کے پھل اور طرح طرح کے چارے نکالے۔ تاکہ یہ ساری چیزیں تمہارے لئے اور تمہارے مویشیوں کے لئے سامان زیست و متاعِ حیات کا کام دیں۔''

ان آیات کریمات سے بخوبی واضح ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کا نظام ربوبیت ساری کائنات پر حاوی ہے۔ انسان سے لے کر تمام حیوانات، نباتات، جمادات اور اللہ تعالیٰ کے ساری نوری، ناری اور خاکی مخلوقات علویات اور سلفیات سب کا خالق و مربی و محافظ اور پروردگار وہی ہے۔

الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۙ﴿۳﴾

جو(15) بہت ہی مہربان اور بہت ہی پیار کرنے والا ہے۔3

ایک انسان تمام دنیا سے آنکھیں بند کر لے لیکن بہر حال اپنی شب و روز کی غذا کی طرف سے تو آنکھیں بند نہیں کر سکتا۔ جو غذا اس کے سامنے دھری ہے اسی پر نظر ڈال لے۔ یہ کیا ہے؟ گیہوں کا دانہ ہے۔ اچھا! گیہوں کا ایک دانہ اپنی ہتھیلی پر رکھ لو اور اس کی پیدائش سے لے کر اس کی پختگی و تکمیل تک کے تمام احوال و ظروف پر غور کرو۔ کیا یہ حقیر سا ایک دانہ بھی وجود میں آ سکتا تھا اگر تمام کارخانۂ ہستی ایک خاص نظم و ترتیب کے ساتھ اس کی بناوٹ میں سرگرم عمل نہ رہتا؟ پھر غور کرو کہ اگر دنیا میں ایک ایسا نظام ربوبیت موجود ہے تو کیا یہ ہو سکتا ہے کہ ربوبیت رکھنے والی ہستی موجود نہ ہو؟

سورہ نحل میں یہی استدلال ایک دوسرے پیرائے میں بیان فرمایا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

''اور دیکھو یہ چار پائے جنہیں تم پالتے ہو ان میں تمہارے غور کرنے اور نتیجہ نکالنے کی کتنی عبرت ہے؟ ان کے جسم سے ہم خون و کثافت کے درمیان دودھ پیدا کر دیتے ہیں جو پینے والوں کے لئے ایک نہایت ہی لذیذ اور صحت بخش مشروب ہوتا ہے۔ اسی طرح کھجور اور انگور کے پھل ہیں جن سے نشہ کا عرق اور اچھی غذا دونوں طرح کی چیزیں حاصل کرتے ہو۔ بلاشبہ اس میں ارباب عقل و بصیرت کے لیے ربوبیت الٰہی کی بڑی نشانی ہے۔ اور پھر دیکھو! تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھی کی طبیعت میں یہ بات ڈال کر پہاڑوں میں اور درختوں میں اور ان چھپروں میں جو اس غرض کے لئے بلند کر دی جاتی ہیں اپنے لئے گھر بنائے پھر ہر طرح کے پھولوں سے رس چوسے پھر اپنے ربّ کے ٹھہرائے ہوئے طریقوں پر کامل فرمانبرداری کے ساتھ گامزن ہو، چنانچہ تم دیکھتے ہو کہ اس کے جسم سے مختلف رنگتوں کا رس نکلتا ہے جس میں انسان کے لئے شفا ہے بلاشبہ اس بات میں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں ربوبیت الٰہی کی بڑی نشانی ہے۔'' اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۳﴾

رحمت الٰہی کی وسعت ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے:

15: ''الرحمٰن'' اور ''الرحیم'' اگرچہ دونوں اسم رحمت سے ہیں لیکن یہ رحمت کے دو مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں۔ رحمت کا ایک پہلو رحمت عامہ سے تعلق رکھتا ہے جس کو ''الرحمٰن'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی وہ رحمت جو محض صفت عارضہ ہونے کے باعث اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق کے لئے یکساں کام کرتی ہے۔ ''الرحیم'' کے معنی یہ ہوئے کہ وہ ذات جس میں نہ صرف رحمت ہے بلکہ جس سے ہمیشہ رحمت کا ظہور ہوتا ہی رہتا ہے اور ہر آن اور ہر لحہ تمام کائنات خلقت اسی سے فیضیاب ہو رہی ہے۔ اگر اس کی صفت ''الرحیم'' نہ ہوتی تو ہر ظالم اور زیادتی کرنے والا ظلم اور زیادتی کرتے ہی اس کے نتیجہ سے دوچار ہو جاتا اور اس کو معافی طلب کرنے کی بھی مہلت نہ ملتی۔

رحمت کو دو الگ الگ صفتوں سے کیوں تعبیر کیا گیا؟ اس لئے کہ قرآن کریم خدا کا جو نقشہ ذہن نشین کرانا چاہتا ہے اس میں سب سے نمایاں اور سب صفات پر چھائی ہوئی صفت، رحمت ہی کی صفت ہے بلکہ آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ تمام تر وہ رحمت ہی رحمت ہے۔

وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ؕ (۱۵۶:۷) ''اور میری رحمت دنیا کی ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔

پس ضروری ہوا کہ خصوصیت کے ساتھ اس کی صفتی اور فعلی دونوں حیثیتیں واضح کر دی جائیں یعنی اس میں رحمت ہے کیونکہ وہ ''الرحمٰن'' ہے اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ہمیشہ اس سے رحمت کا ظہور بھی ہو رہا ہے کیونکہ وہ رحمٰن ہونے کے ساتھ ساتھ ''الرحیم'' بھی ہے۔ ''الرحمٰن الرحیم'' فاتحہ کی تیسری آیت ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ان صفات کا اظہار ہر نبی علیہ السلام نے اپنے اپنے وقت میں کیا۔ الہامی کلام کی یہ سب سے بڑی خوبی ہے کہ اس میں مجازات کی کثرت ہوتی ہے اور وہی مجازات ہیں جو اس کی تاثیر کا زیور اور اس کی دلنشینی کی خوبروئی ہیں لیکن افسوس کہ دنیا والوں نے ہمیشہ ان کے سمجھنے میں ٹھوکر کھائی اور مجازات کو حقیقت سمجھ کر غلط فہمیوں کا شکار ہو گئے۔ مثلاً مسیح علیہ السلام نے کہا ہے کہ ''دشمنوں سے پیار کرو'' تو یقیناً اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ انسان کو چاہیے کہ اپنے دشمنوں کا عاشق زار ہو جائے بلکہ سیدھا سادا مطلب یہ تھا کہ تم میں غیظ و غضب اور نفرت و انتقام کی جگہ رحم و محبت کا پر جوش جذبہ ہونا چاہیے اور ایسا ہونا چاہیے کہ دوست تو دوست دشمن تک کے ساتھ عفو و درگزر سے پیش آؤ۔ اس مطلب کے لئے کہ رحم کرو، بخش دو، معاف کرو انتقام کے پیچھے نہ پڑو۔ یہ ایک نہایت ہی بلیغ اور مؤثر پیرایہ بیان ہے کہ: ''دشمنوں تک کو پیار کرو'' ایسے ماحول میں جہاں اپنوں اور عزیزوں کے ساتھ بھی رحم و محبت کا برتاؤ نہ کیا جاتا ہو یہ کہنا کہ اپنے دشمنوں سے بھی نفرت نہ کرو رحم و محبت کی ضرورت کا ایک اعلیٰ اور کامل ترین تخیل ہے لیکن افسوس کہ لوگوں نے اس کو کیا سمجھا؟

''الرحمٰن'' ''الرحیم'' کی رحمت کا شاہکار خود بانی اسلام محمد رسول اللہ ﷺ ہیں جو ''رحمۃ للعالمین'' کے خطاب سے نوازے گئے۔ آپ ﷺ کو یہ خطاب کیوں دیا گیا؟ اس لئے کہ آپ ﷺ نے نفرت کو مٹانے اور محبت کو پھیلانے کا کام کیا، محبت اور رحمت لازم و ملزوم ہیں۔ آپ ﷺ نے گناہوں سے نفرت سکھائی لیکن گنہگاروں سے محبت کا درس دیا۔ آپ ﷺ نے مرض سے دُور رہنے اور مریض کے قریب ہونے کا حکم دیا۔ جس سے آپ ﷺ مجسمہ رحمت و رافت اور شفقت قرار پائے۔ اللھم صلی علی محمد و علی آل محمد۔

چونکہ تمثیل سے سمجھنا اور سمجھانا آسان ہوتا ہے اور بات دل میں بیٹھ جاتی ہے اس لئے آپ ''الرحمٰن'' و ''الرحیم'' کو زیر نظر تمثیل سے سمجھو۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر کبیر میں ''الرحمٰن'' کو تمثیل سے اس طرح سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

حضرت ابراہیم بن ادھمؒ سے حکایت ہے کہ انہوں نے کہا: ''میں ایک شخص کے پاس مہمان تھا۔ میزبان نے کھانا تیار کرایا اور میرے سامنے لے کر رکھا تا کہ میں میزبان کے ساتھ مل کر کھاؤں جب ہم کھانے لگے تو اچانک ایک کوّا آیا اور جو روٹیاں رکھی تھیں ان میں سے ایک روٹی اٹھا کر اڑ گیا۔ میں بہت حیران ہوا کہ کوا اور پوری روٹی اٹھا کے اڑتا بنا۔ میں فوراً اس کے پیچھے دوڑا۔ کچھ فاصلے پر ایک ٹیلہ تھا اور ٹیلے کے پیچھے ایک شخص کو مشکیں باندھ کر ڈال دیا گیا تھا جو زندہ تھا لیکن اپنی جگہ سے ہل جل نہیں سکتا تھا کوّے نے وہ روٹی اس شخص کے بالکل قریب جا کر گرا دی یا کوّے کی چونچ سے وہ روٹی عین اس شخص کے سر کے قریب گر گئی۔ اب اس شخص کو روٹی کے کھا لینے میں کوئی شے مانع نہ تھی۔ یہ اس ''الرحمٰن'' کی رحمانیت کا تقاضا تھا جو اس طرح پورا ہوا۔ ''سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم'' ۔

''الرحمٰن'' کی رحمانیت کو سمجھنے کے لئے اور غور کرو۔ امام رازی اپنی تفسیر کبیر میں رقمطراز ہیں کہ:

''کوّے کے بچے کی حکایت کو مشاہدہ کر کے دیکھ سکتے ہو کہ جب وہ انڈے کے چھلکے سے نکلتا ہے تو بغیر بالوں کے ایک گوشت کے ٹکڑے کی طرح ہوتا ہے چونکہ متحرک ہوتا ہے جب کوّا اس کو دیکھتا ہے تو اسے چھوڑ کر فرار ہو جاتا ہے وہ کائیں کائیں کرتا ہے۔ ہر آنے جانے والے کو ٹھونگے لگاتا ہے اور اضطراری حالت میں اڑتا پھرتا ہے لیکن آشیانہ کے قریب تک نہیں جاتا اور نہ ہی وہ اپنے بچے کی پرورش کرتا ہے چونکہ بچہ ایک گوشت کے لوتھڑے کی طرح ہوتا ہے لہٰذا اسی شبہ میں مچھر اِدھر اُدھر سے اُڑ اُڑ کر اس پر اکٹھا ہونا شروع ہو جاتا ہے اور وہی مچھر اس کوّے کے بچے کی غذا بنتا ہے اور یہ حال کئی دنوں تک جاری رہتا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد بچے کے پر و بال اگ آتے ہیں اور وہ سیاہ رنگ کا ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس میں کچھ طاقت بھی آ جاتی ہے یہاں تک کہ اس کے بالوں میں گوشت پورا چھپ جاتا ہے اس وقت اس کے ماں باپ اس کے پاس آتے ہیں اور اس کی غذا کا بندوبست سنبھال لیتے ہیں۔ اس سے سمجھا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فضل عام ہے اور اس کی صفت ''الرحمٰن'' اس وقت بھی سہارا بن جاتی ہے جب کوئی اور سہارا نظر نہیں آتا۔ الحمد للہ علی ذلک

''الرحیم'' بھی اللہ تعالیٰ کی خاص صفت ہے، اس کی وسعت کو سمجھانے کے لئے امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں ایک حدیث بیان کی ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی اس صفت پر روشنی پڑتی ہے وہ کہتے ہیں:

''حدیث میں ہے کہ ایک قریب المرگ نوجوان کی زبان کلمہ شہادت ادا کرنے سے رک گئی نزع کی حالت طاری تھی لیکن جان نکلتی بھی نہیں تھی۔ صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ ﷺ کو اس کی خبر دی۔ آپ ﷺ تشریف لائے اور اس کے قریب ہی کھڑے ہو گئے۔ مرنے والے پر کلمہ شہادت لوٹایا۔ وہ متحرک و مضطرب ہوتا مگر اس کی زبان کام نہ کرتی ادائیگی الفاظ بالکل رک گئی۔ نبی کریم ﷺ نے دریافت فرمایا کہ: کیا یہ نماز پڑھتا تھا؟ مثبت جواب پا کر آپ ﷺ نے فرمایا کیا روزہ رکھتا تھا؟ اس کا جواب بھی ہاں میں دیا گیا آپ ﷺ نے استفسار کہ زکوٰۃ ادا کرتا تھا؟ صحابہؓ نے عرض کیا جی ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا کیا والدین کا نافرمان تھا؟ لوگوں نے اس کا جواب بھی ہاں میں دیا کہ اس کی والدہ اب بھی موجود ہے لیکن وہ یہاں آنا پسند نہیں کرتی۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جاؤ اس کی والدہ کو لے آؤ۔ آپ ﷺ کے حکم کے مطابق اس کی والدہ لائی گئی وہ ایک بوڑھی خاتون تھی۔ آپ ﷺ نے پوچھا کیا یہ تیرا بیٹا ہے؟ بڑھیا نے کہا ہاں! میرا بیٹا ہے! آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کا گناہ معاف کر دے اس نے کہا، کہ میں اسے معاف نہیں کروں گی۔ اس نے مجھے تھپڑ مارا اور میری آنکھ پھوٹ گئی۔

رسول اللہ ﷺ نے بڑھیا کی بات سن کر صحابہؓ کو حکم دیا کہ لکڑیاں لاؤ اور آگ جلاؤ۔ خاتون نے پوچھا کہ آگ کس لئے جلائی جا رہی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا اس لئے تاکہ تیرے اس نافرمان بیٹے کو تیری آنکھوں کے سامنے جلایا جائے اور اس نے تیرے ساتھ جو زیادتی کی ہے اس کا بدلہ پائے۔'' خاتون نے فوراً بیٹے کو مخاطب کیا اور کہنے لگی بیٹا میں نے تجھے معاف کیا، کیا میں نے تجھے نو مہینے آگ کے لئے اُٹھایا تھا۔ کیا میں نے دو سال تک تجھے دودھ آگ کے لئے پلایا تھا؟ ماں کا معاف کرنا تھا کہ بیٹے کی زبان پر کلمہ توحید جاری ہو گیا۔''

اللہ تعالیٰ کی اس صفت ''الرحیم'' نے والدہ کی اتنی سخت نفرت کو پھر ماں کی ممتا میں بدل دیا اور والدہ کی اس سختی کو جو اس نے بیٹے کی نافرمانی کی وجہ سے اختیار کی تھی رحمت میں تبدیل کر دیا اور بیٹے کو بھی اس کی غلطی کا احساس دلا دیا اور مرنے سے پہلے توبہ کی توفیق عطا فرما دی۔''

گویا ''ربّ العلمین'' کے بعد ''الرحمٰن الرحیم'' کا دوبارہ ذکر کر کے اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ نظام ربوبیت کے بعد تمام نظام عالم اللہ تعالیٰ کی صفت رحم کا ظہور ہے گویا یہ تمام کارگاہ عالم اور یہ سارا کائنات صرف اس لئے ہی ہا تا کہ اس سے ہمیں فائدہ پہنچے اور ہماری ضرورتیں پوری ہوں۔ اس مضمون کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بہت جگہ تفصیل سے بیان فرمایا ہے چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے:

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (الجاثیہ ۴۵: ۱۳)

''اور وہ اللہ ہی ہے جس نے آسمان کی جملہ مخلوق اور زمین کی ساری چیزوں کو (اپنے خاص فضل و کرم سے) تمہارے تابع کر دیا (اور یہ انعامات تم کو عطا فرمائے ہیں) نقل و خرد رکھنے والے اور غور و فکر کرنے والے لوگوں کے لئے ان میں (قدرتِ الٰہی کی) بے شمار نشانیاں موجود ہیں۔''

نہ صرف زمین و آسمان کے درمیان خلاء بلکہ زمین کے پیٹ میں بھی اس نے اپنی رحمت و نعمت کے بے شمار خزانے اپنی مخلوق کے لئے مخفی کر رکھے ہیں جو محض اس کی شفقت اور مہربانی سے زمین کی سطح پر نمودار ہوتے ہیں اور اس کی ساری مخلوق ان سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ زمین کی سطح پھلوں، پھولوں، غلہ، ترکاریوں اور میووں سے مالا مال ہے اور پانی کی شفاف اور شیریں چشمے اس کے پیٹ سے ابل کر اس کی سطح پر بہہ رہے ہیں اور زمین کی گہرائیاں سونے چاندی اور دیگر قیمتی معدنیات سے پر ہیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ هُوَ الَّذِیْ مَدَّ الْاَرْضَ وَ جَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ وَ اَنْهٰرًا ؕ وَ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِیْهَا زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ وَ فِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّ جَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّ زَرْعٌ وَّ نَخِیْلٌ صِنْوَانٌ وَّ غَیْرُ صِنْوَانٍ یُّسْقٰی بِمَآءٍ وَّاحِدٍ ۫ وَ نُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰی بَعْضٍ فِی الْاُكُلِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝ (الرعد ۱۳: ۳، ۴)

''وہ اللہ ہی ہے جس نے زمین کو بچھونے کی طرح پھیلا کر بچھا دیا اور اس پر پہاڑوں کو میخوں کی طرح نہایت مضبوط طریقہ سے گاڑ دیا اور اس پر دریا رواں کر دیئے اور اس ذات واحد نے پھلوں کے جوڑے تلخ وشیریں ذائقہ میں، سیاہ وسفید وسرخ وزرد وغیرہ رنگت میں، گرم، سرد اور تر وخشک مزاج میں پیدا کئے، اور وہی ان کی گرمی اور روشنی پر لوگوں کے آرام کے لئے رات کی تاریکی اور سردی لاتا ہے۔ غور وفکر اور سوچ و بچار سے کام لینے والوں کے لئے ان تمام چیزوں میں قدرت خداوندی کی بے شمار نشانیاں موجود ہیں۔ دیکھ لو زمین میں الگ الگ مگر قریب اور متصل خطے پائے جاتے ہیں۔ بعض نرم ہیں کہ وہاں کاشت ہوسکتی ہے بعض سخت اور پتھریلے ہیں کہ جہاں زراعت وکاشت نہیں کی جاسکتی اس زمین میں کہیں انگور کے باغات ہیں، کہیں لہلہاتی کھیتیاں ہیں، کہیں کھجور کے نخلستان ہیں کچھ ان میں اکہرے ہیں اور بعض دوہرے ہیں سب کو ایک ہی پانی سیراب کرتا ہے۔ مگر خشبو اور بدبو میں اور ذائقہ اور رنگ میں ہم ایک دوسرے سے جدا اور بڑھیا گھٹیا کر دیتے ہیں۔ عقل و دانش رکھنے والوں کے لئے ان ساری چیزوں میں بے شمار (قدرت کی) نشانیاں موجود ہیں۔ (یعنی ان میں توحید کے دلائل موجود ہیں)۔''

خشکی کے علاوہ تری میں بھی اس کی رحمت عامہ کے آثار نمایاں اور ہویدا ہیں۔ مثال کے طور پر سمندروں کی سطح جہازوں اور کشتیوں کے ذریعے نقل وحرکت اور آمدورفت کے لئے اعلیٰ شاہراہ کا کام دیتی ہے اور اس کی گہرائی موتیوں اور دیگر مفید قیمتی اشیاء سے مالا مال ہے نیز دریاؤں اور سمندروں سے مچھلی کا تازہ بتازہ گوشت حاصل ہوتا ہے جو انسان کے لئے بہترین غذا ہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

وَ هُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِیًّا وَّ تَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْیَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَ تَرَی الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِیْهِ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ (النحل ۱۶: ۱۴)

''اور تمہارا پروردگار وہ ہے جس نے تمہارے لئے سمندر کو مسخر کر دیا ہے جس میں اپنے کھانے کے لئے مچھلی کا تر وتازہ گوشت حاصل کرتے ہو اور اس کی تہوں میں سے غوطہ زن موتی وغیرہ نکال لاتے ہو اور جس سے تم اپنے زیورات بناتے ہو اور تم کشتیوں کو ملاحظہ کرتے ہو کہ وہ سمندروں کا سینہ چیرتی ہوئی پھرتی ہیں تاکہ ان کے ذریعہ (بحری تجارت سے) منافع حاصل کرو اور اس کا شکر ادا کرو۔''

ان آیات کریمات کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے اس جہان کا ذرہ ذرہ پیدا کر کے پورے نظام عالم کو اپنے نظام ربوبیت کے تحت رکھا ہوا ہے اور اس کا نظام ربوبیت اس کے رحم وکرم اور اس کی رحمت وشفقت کے تحت چل رہا ہے۔ پورے نظام عالم کا ایک ذرہ لمحہ کے لئے بھی اس کی رحمت سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح یہ خشکی اور تری کی ساری نعمتیں عالم جسمانی کی تربیت اور پرورش کے لئے پیدا فرمائی ہیں اسی طرح اس کی رحمت بے پایاں نے عالم روحانی کی ترقی اور نشوونما کے لئے بھی انتظام فرمایا اور دنیا میں انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتابوں کے ذریعے عالم روحانی کی غذا کا بندوبست کیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے بعثت اور اپنے آخری پیغام قرآن مجید کی تعلیم کو خصوصیت سے اپنی رحمت کے ساتھ متعلق فرمایا۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

وَ مَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝ (الانبیاء ۲۱: ۱۰۷)

''ہم نے آپ ﷺ کو اس لئے بھیجا ہے تاکہ سارے عالم پر رحم کریں۔''

الحمدللہ کہ دنیا کی تمام نعمتوں سے بڑھ کر نعمت اور دنیا کی تمام رحمتوں اور شفقتوں سے بڑھ کر رحمت اور شفقت خود نبی کریم ﷺ کی نبوت ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ایک طرف روح اور جسد کا تعلق باقی رکھنے کے لئے بے شمار مادی غذائیں مہیا کیں اور دوسری طرف روح کی

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝۴

جو اس دن کا مالک (16) ہے جس دن (17) کاموں کا بدلہ (18) لوگوں کے حصے میں آئے گا (19)۔4

نشوونما کے لئے اعلیٰ درجہ کی روحانی غذا یعنی نبوت احمد مجتبیٰ ﷺ کی مہیا فرمادی۔ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۝

حقیقی مالک ہر چیز کا ''اللہ'' ہی ہے:

16: ''ملک'' کی ''اصل'' م،ل،ک ہے۔ الملک بادشاہ جو عوام پر حکمرانی کرتا ہے ''ملک'' کو اس جگہ ملک بھی پڑھا گیا ہے اور ''مالک'' بھی۔ مفہوم دونوں طرح پڑھنے سے ایک ہی رہتا ہے۔ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ قیامت کے روز اسی کی بادشاہت ہوگی۔ یہ اصل میں ملک الملک فی یوم الدین ہے اور دوسری جگہ فرمایا: لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ؕ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۝ اور مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ قیامت کے روز کا مالک ہے۔ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ (۲۶:۳) ''مالک'' کا لفظ قرآن مجید میں 3 بار استعمال ہوا ہے۔

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ (الفاتحہ ۱:۳)۔ ۲: (ال عمران ۲۶:۳)۔ ۳: (الزخرف ۴۳:۷۷)

''ملک یوم الدین'' فاتحہ کی چوتھی آیت ہے:

17: یوم اور ''الیوم'' کی ''اصل'' ی وم ہے۔ یوم طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک کی مدت اور وقت پر بولا جاتا ہے اور عربی زبان میں مطلقاً وقت اور زمانہ کے لئے استعمال ہوتا ہے خواہ وہ زمانہ ایک دن کا ہو یا ایک سال کا، ایک صدی کا یا ہزار سال کا یا ہزار ہا سال کا۔ جمع ایام، ایام اللہ، اللہ کی نعمتیں۔ من اول یوم یعنی سب سے پہلا دن۔ یوما اسم ظرف منصوب۔ دن یوم، الیوم کا لفظ قرآن مجید میں 348 بار استعمال ہوا ہے۔

''الدین'' کی اصل کیا ہے؟ اور اس کا مطلب کیا؟

18: ''الدین'' کی ''اصل'' د، ی، ن ہے۔ دین بمعنی جزاء، اطاعت شریعت، بدلہ دینا، اطاعت کرنا، حکم ماننا۔ ''دین'' بمعنی ملت ہی ہے مگر اس کا استعمال اطاعت اور شریعت کی پابندی کے معنی میں ہوتا ہے۔ دان یدین کا مصدر ہے اور ''ادیان'' جمع، دین۔ دام، قرض، ادھار، قرض دینا، قرض لینا۔ دان یدین کا مصدر ہے۔ دیون جمع ہے۔

''یوم الدین'' خالصتاً اسلامی اصطلاح ہے:

19: ''يَوْمِ الدِّيْنِ'' بدلے کا دن، (انصاف کا دن، جزا و سزا کا دن، قیامت کا دن)۔

نزول قرآن کے وقت پیروانِ مذاہب کا عالمگیر اعتقاد یہ تھا کہ جزا و سزا محض خدا کی خوشنودی اور اس کے قہر و غضب کا نتیجہ ہے۔ اعمال کے نتائج کو اس میں کوئی دخل نہیں۔ وہ دیکھتے تھے کہ ایک مطلق العنان بادشاہ کبھی خوش ہو کر انعام و اکرام دینے لگتا ہے، کبھی بگڑ کر سزائیں دینے لگتا ہے اس لئے خیال کرتے تھے کہ خدا کا بھی ایسا ہی حال ہے۔ لیکن قرآن کریم نے جزا و سزا کا اعتقاد ایک دوسری ہی شکل و نوعیت کا پیش کیا۔

وہ کہتا ہے کہ کائنات ہستی کا عالمگیر قانون یہ ہے کہ ہر حالت کوئی نہ کوئی اثر رکھتی ہے اور ہر چیز کا کوئی نہ کوئی خاصہ ہے۔ ممکن نہیں یہاں

کوئی شے اپنا وجود رکھتی ہو اور اثرات ونتائج کے سلسلہ سے وہ باہر ہو۔ پس جس طرح خدا نے عالم دنیا کے اجسام میں خواص ونتائج رکھے ہیں۔ اس طرح اعمال میں بھی خواص ونتائج ہیں اور اعمال کے انہیں خواص ونتائج کو جزا وسزا کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اچھے عمل کا نتیجہ اچھائی ہے اور یہی ثواب کہلاتا ہے۔ برے عمل کا نتیجہ برائی ہے اور اس کو عذاب کہتے ہیں۔ ثواب وعذاب کے ان اثرات کی نوعیت کیا ہوگی؟ وحی الٰہی نے ہماری فہم واستعداد کے مطابق اس کا ایک نقشہ کھینچا ہے اور اس نقشہ میں ایک مرقع بہشت کا ہے اور ایک دوزخ کا۔ بہشت کے انعامات ان کے لئے جن کے اعمال بہشتی ہوں گے اور دوزخ کی عقوبتیں ان کے لئے جن کے اعمال دوزخی ہوں گے۔

وہ کہتا ہے، تم دیکھتے ہو کہ فطرت ہر گوشہ وجود میں اپنا قانون مکافات رکھتی ہے ممکن نہیں کہ اس میں تغیر وتساہل ہو۔ فطرت نے آگ میں یہ خاصہ رکھا ہے کہ جلائے۔ اب سوزش اور جل جانا فطرت کی وہ مکافات ہوگئی جو ہر اس انسان کے لئے ہے جو آگ کے شعلوں میں ہاتھ ڈال دے۔ ممکن نہیں کہ تم آگ میں کود جاؤ اور اس فعل کے مکافات سے بچ جاؤ، تم دیکھتے ہو کہ آگ جلاتی ہے پانی ٹھنڈک پیدا کرتا ہے۔ سنکھیا کھانے سے موت آتی ہے اور دودھ پینے سے طاقت وقوت بڑھتی ہے اور کونین سے بخار رک جاتا ہے جب اشیاء کی ان تمام مکافات پر تم کو تعجب نہیں ہوتا کیونکہ یہ تمہاری زندگی کی یقینیات ہیں تو پھر اعمال کے مکافات پر کیوں تعجب ہوتا ہے؟ افسوس تم پر! تم اپنے فیصلوں میں کتنے ناہموار ہو۔

تم گیہوں بوتے ہو اور تمہارے دل میں کبھی خدشہ نہیں گزرتا گیہوں پیدا نہیں ہوگا۔ اگر تم سے کوئی کہے کہ ممکن ہے گیہوں کی جگہ جوار پیدا ہو جائے تو تم اسے پاگل سمجھو گے۔ کیوں؟ اس لئے کہ فطرت کے قانون مکافات کا یقین تمہاری طبیعت میں راسخ ہو چکا ہے۔ تمہارے وہم وگمان میں کبھی یہ خطرہ نہیں گزر سکتا کہ فطرت گیہوں لے کر اس کے بدلے میں جوار دے گی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ تم یہ بھی نہیں مان سکتے کہ اچھی قسم کے گیہوں لے کر بری قسم کے گیہوں دے گی اس لئے کہ تم جانتے ہو کہ وہ بدلہ دینے میں قطعی اور شک وشبہ سے بالاتر ہے پھر بتلاؤ جو فطرت گیہوں کے بدلے گیہوں اور جوار کے بدلے جوار دے رہی ہے کیونکر ممکن ہے کہ اچھے عمل کے بدلے اچھا اور برے عمل کے بدلے برا نتیجہ نہ رکھتی ہو؟

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے جزاء وسزا کے لئے ''الدین'' کا لفظ اختیار کیا کیونکہ مکافات عمل کا مفہوم ادا کرنے کے لئے سب سے زیادہ موزوں لفظ یہی تھا۔ پھر ''مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝'' کہہ کر اس مضمون کو مزید پکا کر دیا کہ وہ اللہ جس کے فیصلوں میں کبھی ردوبدل نہیں ہوتا۔ جو اپنے فیصلے کو نہ خود بدلتا ہے اور نہ بدلنے دیتا ہے۔ مکافات عمل کے دن کا وہ مالک ہے۔ وہ اپنی رحمت اور ربوبیت کے باوجود عدالت بھی رکھتا ہے اور اس کے انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ اچھے اعمال کی جزا اچھی اور برے اعمال کی جزا بری ہو اور یہی مکافات عمل ہے۔

مزید دیکھو کہ اللہ تعالیٰ نے ساری کائنات کو پیدا کیا اور نظام ربوبیت کے تحت ہر چیز کو انسان کی خدمت پر لگا دیا جدھر دیکھو خشکی اور تری پر اس کی رحمت اور نعمت کی چادریں پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں۔ مادی ترقی کے ساتھ ساتھ اس نے روح کی نشوونما کا انتظام بھی فرمایا اور راہ ہدایت میں صراطِ مستقیم بتانے کے لئے کتابیں اور رسول بھیجے اور آخر میں آخری پیغمبر حضرت محمد ﷺ پر اپنی آخری کتاب قرآن مجید نازل فرما کر نعمت اسلام کی تکمیل فرما دی۔ اس سارے نظام ربوبیت کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ایک ایسا دن ضرور ہونا چاہیے جس میں اس امر کا فیصلہ ہو سکے کہ کس نے اللہ کی ان تمام نعمتوں کا شکر ادا کیا اور کس نے ناشکری کی۔ کس نے اللہ کی بھیجی ہوئی ہدایت پر عمل کیا اور اس کے احکام کی تعمیل کی اور کس نے اس کے ہدایت اور اس کے احکام کو ٹھکرا دیا۔ ایسا دن تو دنیا میں ہو نہیں سکتا کیونکہ یہ دار العمل ہے، اس لئے لامحالہ ایسا دن دنیا کے اختتام پر ہی ہو سکتا ہے۔ اسی دن کا نام ''یوم الدین'' ہے اور اس کو یوم آخر یا روز جزاء کہتے ہیں کیونکہ یہ دن دنیا کے ختم ہونے پر آئے گا اس میں نیک وبد اعمال کا بدلہ دیا جائے گا۔ اس دن میں ہر قسم کے تمام اختیارات صرف اور صرف اللہ کے قبضے میں ہوں گے وہاں مجازی

طور پر بھی کسی کو کوئی اختیار یا اقتدار حاصل نہیں ہوگا۔ اس کی وضاحت کی ضرورت اس لئے ہوئی کہ اہل کتاب کے علماء سوء ان کے احبار و رہبان اور ان کے پیروں اور پادریوں کو چونکہ حق چھپانے، حق و باطل کو ملانے، غلط بیانی کرنے اور تورات و انجیل کی آیتوں میں لفظی اور معنوی تحریفیں اور تبدیلیاں کرنے کی عادت پڑ چکی تھی اس لئے انہوں نے اپنے عوام میں بہت سے غلط عقائد پھیلا رکھے تھے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے جابجا ان کے کرتوتوں کو ظاہر فرمایا ہے تاکہ امت محمد یہ اس سے عبرت حاصل کرے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَ قَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾ (بقرہ ۲:۷۵)

''ان (یہود) میں ایک گروہ ایسا تھا جو اللہ کا کلام سنتا تھا اور اس کا مطلب سمجھتا تھا لیکن پھر بھی جان بوجھ کر اس میں تحریف کر دیتا تھا یعنی اس کا مطلب بدل دیتا تھا''۔

بنی اسرائیل کی سب سے پہلی گمراہی یہ تھی کہ نہ تو کتاب اللہ کا سچا علم ان میں باقی رہا اور نہ سچا عمل۔

ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے:

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۷۱﴾ (آل عمران ۳:۷۱)

''اے اہل کتاب! کیوں حق و باطل کے ساتھ ملا جلا کر مشتبہ کر دیتے ہو اور حق کو چھپاتے ہو حالانکہ تم جانتے ہو کہ اصلیت کیا ہے؟''

ایک جگہ ارشاد ہوا:

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ؕ (المائدہ ۵:۴۲)

''یہ لوگ جھوٹ کے لئے کان لگانے والے اور برے طریقوں سے مال کھانے میں بیباک ہو چکے ہیں''

یعنی رشوت اور نذرانہ لے کر فتویٰ دیتے ہیں اور احکام شرع کی خرید و فروخت کی دکان لگا رکھی ہے۔

اہل کتاب کے پادریوں اور صوفیوں نے آخرت کے بارے میں ایک نہایت ہی غلط تصور عوام کے ذہن نشین کرا رکھا تھا۔ اپنے متعلق تو انہوں نے عوامی ذہن میں یہ بات بٹھا رکھی تھی کہ ہم اللہ کے محبوب اور چہیتے ہیں اور اللہ کے بیٹے ہیں یعنی جس طرح باپ کی صفات بیٹوں میں ہوتی ہیں اسی طرح اللہ کی صفات ہم میں موجود ہیں اس لئے آخرت میں ہمیں تو کسی قسم کا عذاب ہوگا ہی نہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے:

وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ وَ النَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ (المائدہ ۵:۱۸)

''اور یہودی اور عیسائی کہتے ہیں، ہم خدا کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں''

یعنی ہم جو کچھ بھی کریں ہمارے لئے نجات ہی نجات ہے۔ عوام کو انہوں نے یقین دلا رکھا تھا کہ جنت ان کے لئے ریزرو (Reserve) ہے ان کے سوا اور کوئی جنت میں داخل نہیں ہو سکے گا۔

جیسا کہ فرمان الٰہی ہے:

وَ قَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ (البقرہ ۲:۱۱۱)

''انہوں نے کہا جنت میں ہرگز داخل نہ ہوگا مگر وہی جو یہودی ہوگا یا عیسائی''

حالانکہ ان کا یہ کہنا ان کے اپنے بیان کے بھی بالکل خلاف ہے کیونکہ وہ دونوں ایک دوسرے کو برملا جھٹلا چکے ہیں۔

ارشاد الٰہی ہے:

وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَىْءٍ ۖ وَّ قَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَىْءٍ ۙ وَّ هُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ

(البقرہ ۱:۱۱۳)

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝

ہم صرف (20) تیری ہی بندگی (21) کرتے ہیں اور صرف تُو ہی ہے جس سے ہم اپنی ساری احتیاجوں (22) میں مدد مانگتے ہیں (23)۔5

''یہودی کہتے ہیں عیسائیوں کا دین کچھ نہیں ہے عیسائی کہتے ہیں یہودیوں کے پاس کیا دھرا ہے؟ حالانکہ اللہ کی کتاب دونوں پڑھتے ہیں''۔

قرآن کہتا ہے خدا کی سچائی سب کے لئے ہے اور سب کو ملی تھی لیکن سب نے سچائی سے انحراف کیا۔ سب اصل کے اعتبار سے سچے اور عمل کے اعتبار سے جھوٹے ہیں میں چاہتا ہوں اسی مشترک اور عالمگیر سچائی پر
سب کو جمع کر دوں اور مذہبی نزاع کا خاتمہ ہو جائے۔ یہ مشترک اور عالمگیر سچائی کیا ہے؟ خدا پرستی اور نیک عملی کا قانون ہے یہی قانون ہے جو خدا کا ٹھہرایا ہوا دین ہے اور اس کو میں ''الاسلام'' کے نام سے پکارتا ہوں۔

اہل کتاب کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ حضرت عزیر اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام اور ان کے پیر اور پادری سب حاجت روا مشکل کشا اور شفیع غالب ہیں اور قیامت کے دن ان کو عذاب سے بچا لیں گے جیسا کہ قرآن مجید میں ان کے عقیدہ کو بیان کیا گیا ہے:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ (التوبہ ۹:۳۱)

''ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے علماء اور مشائخ کو پروردگار بنا لیا تھا اور مریم علیہا السلام کے بیٹے مسیح علیہ لسلام کو بھی۔''

سورۂ فاتحہ میں جس طرح دوسرے باطل عقیدوں کی تردید کی گئی ہے اسی طرح ''ملک یوم الدین'' سے اہل کتاب کے غلط تصور آخرت کی تردید فرمائی کہ قیامت کے دن کا مالک تو صرف اللہ ہی ہے اور اس کے ہاتھ میں سب کا حساب و کتاب اور عذاب و ثواب ہے جو ان لوگوں کے اپنے ہی کئے کا رزلٹ ہے۔ جن کو تم اللہ کے سوا معبود سمجھ رہے ہو اور ان کو مالک و مختار اور شفیع غالب مان رہے ہو اور جن کے بارے میں تمہارا عقیدہ ہے کہ قیامت کے دن وہ خدا کے عذاب سے جو انہی کے کئے کا نتیجہ ہوگا چھڑا لیں گے۔ یاد رکھو قیامت کے دن ان کا کوئی زور نہیں چلے گا اور نہ ہی ان کو کسی قسم کے تصرف کا اختیار ہوگا اور نہ ہی وہ کوئی بات منوا سکیں گے کیونکہ تصرف صرف وہی کر سکتا ہے جو مالک و مختار ہو اور قیامت کے دن کا مالک صرف اور صرف اللہ ہی ہے اور سب کے نیک و بد اعمال کو جاننے والا بھی وہی ہے اسلئے وہی لوگوں کے اعمال کی جزا و سزا کا مالک ہے اس کے سوا کسی میں قدرت نہیں کہ اعمال کا حساب لے اور ہر ایک کے حسب حال اور حسب نیک و بد اعمال کی جزا و سزا دے۔ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ؕ وَ الْاَمْرُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ ۝ (الانفطار ۸۲:۱۹)

''ایاک'' کلمہ حصر ہے، یعنی صرف تجھ ہی سے:

20: تجھ ہی سے تجھ ہی کو ''ایاک''۔ واحد مذکر حاضر کی ضمیر۔ منصوب منفصل۔ ''ایا'' کے ساتھ جب یاء متکلم کاف خطاب ہاء غائب اور دیگر فروع متکلم و مخاطب و غائب لاحق ہوتے ہیں تو اس وقت یہ ضمیر منصوب منفصل ہوتی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ اسم ظاہر ہے جو ضمائر کی طرف مضاف ہوتا ہے مگر یہ صحیح نہیں اور اس میں مزید بحث بھی ہے۔

ایاک اور ایاکم یعنی جمع مذکر حاضر کی ضمیر منصوب منفصل قرآن مجید میں 8 بار استعمال ہوئی ہے۔ ''ایاک'' (فاتحہ ۱:۵) میں دو بار اور ایاکم 6 بار آیا ہے۔ ''اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝'' فاتحہ کی پانچویں آیت ہے۔

عبادت وہ تعظیم ہے جو اللہ کے سوا کسی کے لئے جائز نہیں ہے:

21: ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ ''نعبد'' جمع متکلم، مضارع، یعنی ہم عبادت کرتے ہیں یا ہم عبادت کریں گے۔ اس کی ''اصل'' ع ب د ہے۔ ''عبادۃ'' عبد یعبد کا مصدر ہے جس کے معنی پرستش کرنے یا پوجنے کے ہیں۔ امام راغب کہتے ہیں ''عبودیت'' اظہار فروتنی کا نام ہے اور ''عبادۃ'' اس سے بھی بلیغ تر ہے کیونکہ اس کے معنی انتہائی فروتنی کے ہیں اور اس کا استحقاق بھی سوائے اس ذات عالی کے جس کے افضال وانعام بے حد ونہایت ہیں اور کسی کو نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ'' نہ عبادت کرو مگر صرف اور صرف اس کی یعنی اللہ تعالیٰ کی قاموس میں عبادت کے معنی اطاعت کے بیان کئے گئے ہیں لیکن ابن الاثیر نے نہایہ میں فرمایا ہے کہ: العبادۃ فی اللغۃ الطاعۃ مع الخضوع۔ ''لغت میں عبادت نام ہے اس اطاعت کا جو عاجزی کے ساتھ ہو''۔

قاضی شوکانی فتح القدیر میں کہتے ہیں ''وفی الشرع عبادۃ عما یجمع کمال محبۃ والخضوع الخوف'' شرع میں عبادت وہ ہے جو انتہائی محبت، فروتنی اور خوف پر مشتمل ہو۔

اعجاز القرآن میں ہے: '' العبادۃ تذلل لغیر عن اختیار الغایۃ تعظیمہ فخرج التسخیر والسخر والقیام والانحناء لنوع تعظیم۔'' عبادت اپنے اختیار سے دوسرے کی انتہائی تعظیم کی غرض سے اس کے لئے فروتنی کا نام ہے لہٰذا تسخیر کی بناء پر یا مذاق کی غرض سے ایسا کرنا نیز تعظیم رسمی کے لئے کسی کے واسطے کھڑا ہو جانا یا جھک جانا عبادت کی تعریف سے خارج ہے۔ ہاں جس کام سے نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا ہے وہ بہر حال ممنوع ہے۔

جو ''استعانت'' غیر اللہ سے حرام ہے:

22: ''نستعین'' جس کی ''اصل'' ع و ن ہے۔ جمع متکلم کا صیغہ ہے یعنی ہم مدد طلب کرتے ہیں۔ استعینوا تم مدد طلب کرو مصدر۔ استعانۃ ہے جس کے معنی مدد چاہنے کے ہیں۔ استعانت اللہ تعالیٰ سے خاص ہے اور غیر اللہ سے مدد طلب کرنا جب وہ موجود نہ ہو اور مدد کرنے کی طاقت بھی نہ رکھتا ہو حرام ہے۔

نستعین کا لفظ ایک ہی بار یعنی یہاں سورۂ فاتحہ میں استعمال ہوا ہے اور ۲ بار المستعان کا لفظ آیا ہے سورۂ یوسف کی آیت ۱۸، اور المائدہ ۵ کی آیت ۱۱۲ میں، فقط اسی طرح اعانۃ سورۃ الفرقان کی آیت ۴ میں فاعینونی سورہ الکہف کی آیت ۹۵ میں اور تعاونوا کے الفاظ صرف دو بار استعمال ہوئے ہیں اور دونوں بار سورہ المائدہ کی آیت ۲ میں لیکن استعینوا کا لفظ تین بار استعمال ہوا ہے۔ البقرہ کی آیت ۴۵، اور آیت ۱۵۳ میں اور سورۃ الاعراف کی آیت ۱۲۸ میں اور اسی طرح عوان کا لفظ بھی صرف ایک بار ''عوان بین ذلک'' سورہ بقرہ کی آیت ۶۸ میں استعمال ہوا، اس کے علاوہ کہیں بھی قرآن مجید میں استعمال نہیں ہوا۔

ربّ بھی اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام ہے جو اللہ ہی کے لیے استعمال کرنا چاہیے:

23: ''ربوبیت'' ''رحمت'' اور ''عدالت'' اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں۔ اسلام سے پہلے جتنے مذاہب تھے سب کو اللہ تعالیٰ کی صفات ہی میں ٹھوکر لگی تھی۔ صرف اور صرف اسلام ہی وہ دین ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے لئے لازم قرار دیا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ ذات میں واحد ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں۔ بالکل اسی طرح وہ اپنی صفات میں بھی واحد ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں۔ جس طرح اس کی ذات کے لیے کوئی مثال قائم نہیں کی جاسکتی بالکل اسی طرح اس کی صفات میں بھی کوئی اس کی مثل نہیں ہوسکتا: ''اشہد ان لا الہ الا اللہ

وحدہ لا شریک لہ۔ لا مثل لہ و لا مثال لہ لا ضدلہ و لا ندلہ"

قرآن کریم نے توحید فی الصفات کا ایسا کامل نقشہ کھینچ دیا ہے کہ اس طرح کی لغزشوں کے تمام دروازے بند ہو گئے جس طرح کی لغزشیں پہلوں سے سرزد ہو چکی تھیں۔ اس نے صرف توحید ہی پر زور نہیں دیا بلکہ شرک کی راہیں بھی مسدود کر دیں اور یہی اس باب میں اس کی خصوصیت ہے۔

وہ کہتا ہے: ہر طرح کی عبادت و نیاز کی مستحق صرف اور صرف خدا کی ذات ہے پس اگر تم نے عابدانہ عجز و نیاز کے ساتھ کسی دوسری ہستی کے سامنے سر جھکایا تو توحید الٰہی کا اعتقاد باقی نہ رہا۔ وہ کہتا ہے: اسی کی ذات ہے جو انسانوں کی پکار سنتی اور ان کی دعائیں قبول کرتی ہیں۔ پس اگر تم نے اپنی دعاؤں اور طلب گاریوں میں کسی دوسری ہستی کو بھی شریک کیا تو گویا تم نے اس خدا کی خدائی میں شریک کر لیا۔

وہ کہتا ہے: دعا و استعانت، رکوع، سجود، عجز و نیاز، اعتماد و توکل اور اس طرح کے تمام عبادت گزارانہ اور نیاز مندانہ اعمال وہ اعمال ہیں جو خدا اور اس کے بندوں کا باہمی رشتہ قائم کرتے ہیں اگر ان اعمال میں تم نے کسی دوسری ہستی کو بھی شریک کر لیا تو اللہ کے رشتہ معبودیت کی یگانگی باقی نہ رہی۔ اسی طرح عظمتوں، کبریائیوں، کارسازیوں اور بے نیازیوں کا جو اعتقاد تمہارے اندر خدا کی ہستی کا تصور پیدا کرتا ہے وہ صرف خدا ہی کے لئے مخصوص ہونا چاہیے۔ اگر تم نے ویسا ہی اعتقاد کسی دوسری ہستی کے لئے بھی پیدا کر لیا تو تم نے اسے خدا کا ''ند'' یعنی شریک ٹھہرا لیا اور توحید کا اعتقاد درہم برہم ہو گیا۔

یہی وجہ ہے کہ یہاں '' اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝ '' کی تلقین کی گئی اس میں اول تو عبادت کے ساتھ استعانت کا بھی ذکر کیا گیا۔ پھر دونوں جگہ مفعول کو مقدم کیا جو مفید اختصاص ہے۔ یعنی صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ ہی سے مدد طلب کرتے ہیں اس کے علاوہ تمام قرآن مجید میں اس کثرت کے ساتھ توحید فی الصفات اور رد اشراک پر زور دیا گیا ہے کہ شاید ہی کوئی سورت بلکہ کوئی صفحہ اس سے خالی ہو۔

سب سے زیادہ اہم مسئلہ مقام نبوت کی حد بندی کا تھا۔ یعنی معلم کی شخصیت کو اس کی اصلی جگہ میں محدود کر دیا، تاکہ شخصیت پرستی کا ہمیشہ کے لئے سد باب ہو جائے اس بارے میں قرآن کریم نے جس طرح صاف اور قطعی لفظوں میں جا بجا پیغمبر اسلام کی بشریت اور بندہ ہونے پر زور دیا ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے ہم یہاں صرف ایک بات کی طرف توجہ دلائیں گے۔ اسلام نے اپنی تعلیم کا بنیادی کلمہ جو قرار دیا ہے وہ سب کو معلوم ہے۔

"اَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ"

یعنی میں اقرار کرتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اقرار کرتا ہوں کہ محمد ﷺ خدا کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔

اس اقرار میں جس طرح خدا کی توحید کا اعتراف کیا گیا ہے۔ ٹھیک اسی طرح پیغمبر اسلام کی انسانیت اور درجہ رسالت کا بھی اعتراف ہے۔

غور کریں کہ ایسا کیوں کیا گیا؟ صرف اس لئے کہ پیغمبر اسلام کی انسانیت اور درجہ رسالت کا اعتقاد اسلام کی اصل اساس بن جائے اور اس کا کوئی موقع باقی نہ رہے کہ عبدیت کی جگہ معبودیت کا اور رسالت کی جگہ اوتار کا تخیل پیدا ہو۔ ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ اس معاملے کا تحفظ نہیں کیا جا سکتا تھا؟ کوئی شخص دائرہ اسلام میں داخل ہی نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ خدا کی توحید کی طرح پیغمبر اسلام کی انسانیت کا بھی اقرار نہ کر لے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں پیغمبر اسلام ﷺ کی وفات کے بعد مسلمانوں میں بہت سے اختلاف پیدا ہوئے لیکن پیغمبر اسلام کی شخصیت کے بارے میں کبھی کوئی سوال پیدا نہیں ہوا ابھی رسول اللہ ﷺ کی وفات پر چند گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے کہ حضرت ابو بکر

صدیقؓ نے برسر منبر اعلان کر دیا تھا:

من کان یعبد محمدا فان محمدا قد مات و من کان منکم یعبد اللہ فان اللہ حی لا یموت (صحیح بخاری)

''جو کوئی تم میں سے محمد ﷺ کی پرستش کرتا تھا سو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ محمد ﷺ نے وفات پائی اور جو کوئی تم میں سے اللہ تعالیٰ کی پرستش کرتا ہے اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کی ذات ہمیشہ زندہ ہے اور اس کے لئے موت نہیں''۔

اب عبادت و استعانت کے متعلق مختصر گفتگو کریں گے اس لئے کہ کہا گیا ہے کہ:

الفاتحۃ سر القران و سرھا ھذہ الکلمۃ ایاک نعبدو ایاک نستعین (ابن کثیر جلد اول ص ۲۵)

جان لینا چاہیے کہ عبادت کے مفہوم میں دو چیزیں داخل ہیں ایک غایت تذلیل یعنی انتہائی عاجزی اور ذلت دوم غایت تعظیم اس اعتقاد اور شعور کے ساتھ کہ معبود کو غائبانہ تصرف اور قدرت حاصل ہے جس سے وہ نفع و نقصان پر قادر ہے کیونکہ معبود صرف وہی ہو سکتا ہے جس میں یہ دو صفتیں موجود ہوں۔

1: وہ عالم الغیب ہو کائنات کا ذرہ ذرہ اس پر منکشف ہو اور زمین و آسمان کی ساری مخلوق کے ظاہر و باطن، سر و علانیہ کو وہ اچھی طرح جانتا ہو۔

2: وہ مالک و مختار، متصرف فی الامور اور اقتدار اعلیٰ کا مالک ہو۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے جہاں کہیں اپنے لئے استحقاق عبادت و پکار کا ذکر فرمایا ہے وہاں اپنی انہی دو صفتوں کو اس کی علت قرار دیا ہے اور جہاں کہیں غیر اللہ سے عبادت و پکار کی نفی کی ہے وہاں غیر سے دونوں صفتوں کی نفی فرمائی ہے البتہ کہیں دونوں صفتوں کی نفی ہے اور کہیں صرف ایک کی نفی ہے چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے:

وَ رَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَ يَخْتَارُ ؕ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝۶۸ وَ رَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَ مَا يُعْلِنُوْنَ ۝۶۹ وَ هُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَ الْاٰخِرَةِ ٘ وَ لَهُ الْحُكْمُ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝۷۰ (القصص ۲۸: ۶۷ تا ۷۰)

''اور آپ کا پروردگار قادر مطلق ہستی ہے جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے جسے چاہے اپنی رسالت اور پیغام رسانی کے لئے منتخب کر لے وہ کسی رائے کا محتاج نہیں اور نہ ہی یہ کام لوگوں کے کرنے کا ہے کیونکہ انہیں معلوم نہیں کہ کس میں کیا صلاحیت ہے اور وہ پاک و منزّہ ہے ان کے شرک سے جو وہ اس کی صفات و اختیارات میں دوسروں کو شریک کرتے ہیں اور آپ کا پروردگار جانتا ہے ان کے سینوں کے مخفی ارادوں کو اور ان کے دلوں میں چھپے ہوئے رازوں کو اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں اس سے بھی باخبر ہے اور وہ ان کے اعمال کے مطابق جزا دے گا وہی اللہ ہے جس کے سوا عبادت و بندگی کے لائق کوئی نہیں اور نہ کوئی اس کا استحقاق ہی رکھتا ہے۔ دنیا و آخرت میں حمد و ستائش صرف اسی کے لئے ہے اور اس کی حکومت ہو گی اور اسی کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔''

ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے:

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا وَ مَا تَحْتَ الثَّرٰى ۝۶ وَ اِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَ اَخْفٰى ۝۷ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۝۸ (طٰہٰ ۲۰: ۶ تا ۸)

''جو کچھ زمین و آسمانوں اور ان کے درمیان میں ہے اور جو کچھ مٹی کے نیچے موجود ہے سب کا مالک وہی ہے (اور اسی کا ان پر تصرف

چلتا ہے)۔ اللہ نہا خانہ قلب میں چھپی بات کو جسے تم آہستہ سے کہو یا پکار کر، خوب جانتا ہے بلکہ اسے تو مخفی تر بات کا بھی علم ہے وہ اللہ ہی کی ذات اقدس ہے اس کے سوا عبادت کے کوئی لائق نہیں۔ اس کے بہترین نام ہیں (اور بہترین صفات کا وہ مالک ہے)۔''

ایک جگہ ارشاد خداوندی ہے:

وَ لِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَ تَوَكَّلْ عَلَيْهِ ؕ وَ مَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

(ہود ۱۱: ۱۲۳)

''اور یاد رکھو اللہ ہی کے لئے آسمان وزمین کی چھپی باتوں کا علم ہے اور سارے کام اسی کے آگے رجوع ہوتے ہیں پس اس کی بندگی میں لگا رہ اور اسی پر بھروسہ کر۔ تیرا پروردگار اس سے غافل نہیں ہے جو لوگ کر رہے ہیں''

ان آیات کے علاوہ سینکڑوں آیات کریمات میں یہ مضمون پوری وضاحت سے بیان کیا گیا ہے ان تمام آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے پہلے اپنی ان دونوں صفتوں کا ذکر فرمایا کہ وہ متصرف ومختار ہے زمین وآسمان میں جو کچھ ہے سب اسی کے قبضہ میں ہے۔ زمین وآسمان کی ساری مخلوق کے تمام معاملات اور سارے کارخانہ عالم کی تدبیر اور پورا نظام عالم اسی کے زیر اقتدار ہے اور زمین وآسمان کے تمام غیوب کو جاننے والا بھی وہی ہے اور مذکورہ تینوں جگہوں میں دونوں صفتیں بیان کرنے کے بعد یہ اعلان فرمایا کہ جب عالم الغیب اور متصرف ومختار اللہ ہے تو معبود بننے اور پکارے جانے کے لائق بھی صرف اللہ ہی ہے۔ تمام صفات کارسازی بھی اسی کے ساتھ مخصوص ہیں۔ لہٰذا تم اسی کی عبادت کرو، اسی کو پکارو اسی کے آگے جھکو اور جو کچھ مانگو اسی سے مانگو۔

چنانچہ علامہ ابن القیم نے عبادت کی تعریف کو ایک جامع تعبیر سے حسب ذیل عبارت میں بیان فرمایا ہے:

العبادة عبادة عن الاعتقاد و الشعور بان للمعبود سلطة غيبية يقدر بها على النفع و الضرر فكل ثناء و دعاء و تعظيم بصاحب هذا الاعتقاد و الشعور فهي عبادة۔ (مدارج السالکین ج اول ص ۴۰)

''یعنی عبادت اس اعتقاد اور شعور کا نام ہے کہ معبود کو ایک غیبی تسلط حاصل ہے جس کی وجہ سے وہ نفع ونقصان پر قادر ہے اس لئے ہر اچھی تعریف ہر پکار اور ہر تعظیم جو اس مذکورہ اعتقاد وشعور کے ساتھ ہو وہ عبادت ہے''۔

اس بیان سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ہر وہ قول اور فعل، دعا اور پکار، ثناء اور تعظیم، رکوع اور سجود، قیام اور قعود جو اس اعتقاد اور شعور کے ساتھ ہو کہ معبود کو مافوق الاسباب ہمارے تمام معاملات پر غیبی قبضہ اور تسلط حاصل ہے اور وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے، عبادت غیر اللہ کی شرک ہے۔

اسی طرح ''استعانت''، یعنی مدد طلب کرنا بھی صرف اسی سے خاص ہے نہ کسی اور سے کیوں؟ اس لئے کہ حاجات ومشکلات میں پکارنا اور مدد مانگنا چونکہ عبادت کی سب سے بڑی اور اہم شاخ ہے اس لئے عبادت کے ساتھ خصوصیت سے اس کا ذکر فرمایا۔ ہر آدمی جو کسی معبود کی عبادت کرتا ہے دنیوی زندگی کے اعتبار سے اس کی عبادت کا مقصد اور لب لباب یہی ہوتا ہے کہ اس کی تمام حاجتیں پوری ہوں اور اس کی تمام مشکلیں آسان ہو جائیں۔ اس لئے ہمارے نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ دعاء وپکار عبادت کا مغز اور لب لباب ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے: الدعاء مخ العبادة اور دوسری جگہ ہے: الدعاء هو العبادة (ابوداؤد ج اول ص ۲۸، ترمذی جلد اول ص ۱۷۳، تفسیر ابن جریر ۲۴ ص ۴۶) ''یعنی پکارنا بھی اصل عبادت ہے۔ قرآن مجید میں بھی لفظ عبادت بمعنی دعاء اور پکار آیا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے''

وَ قَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ﴿۶۰﴾ (مؤمن ۴۰: ۶۰)''

اے پیغمبر ﷺ! آپ ﷺ لوگوں سے کہہ دیں کہ تمہارے پروردگار کا حکم ہے کہ مجھ سے ہی دعائیں کریں میں تمہاری دعائیں قبول

کروں گا (اور انہیں یہ بھی بتادیں کہ) جو لوگ کبر ونخوت اور گھمنڈ میں اگر میری عبادت یعنی پکار سے انحراف کریں گے انہیں قیامت کے روز گھسیٹ کر اور ذلیل وخوار کر کے دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔''

اس آیت کریمہ میں پہلے اللہ نے اپنی پکار کا حکم فرمایا ہے پھر پکار کو لفظ عبادت سے تعبیر فرما کر واضح کر دیا ہے کہ پکار بھی عبادت ہے اور اسی طرح نبی کریم ﷺ نے اس آیت کی تفسیر میں ''عبادتی'' سے مراد ''دعائی'' لے کر مہر تصدیق ثبت کر کے اس بات کی مزید وضاحت فرما دی ہے۔ (تفسیر ابن جریر ج ۲۴ ص ۷۴، ابن کثیر ج ۴ ص ۸۵)

قرآن مجید میں عبادت واستعانت کے اس مضمون کو بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور خصوصاً سورۂ زمر اور حوامیم کا مرکزی مقصد ہی یہ ہے کہ عبادت واستعانت صرف اور صرف اللہ ہی کی ہے۔ فادعوہ مخلصین لہ الدین (۴۰:۶۵) جس کی پوری تشریح ان سورتوں میں موجود ہے۔

یعنی سورۂ فاتحہ میں جس دعویٰ کو '' اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ؕ'' سے بیان کیا گیا ہے اس کی تفصیل اگرچہ قرآن مجید میں جگہ جگہ موجود ہے تاہم حوامیم کا مرکزی مضمون ہی یہ ہے اس لئے تشنہ کاموں کو ان سورتوں کی طرف رجوع کرنا چاہئے تاکہ مذکورہ دعویٰ کے روشن دلائل کا مشاہدہ کر سکیں۔

عبادت اور استعانت کا مفہوم، عبادت اور استعانت کا آپس میں تعلق، عبات اور استعانت دونوں میں ایک جیسا حصر، عبادت اور استعانت میں غیر اللہ کی نفی یعنی نعبد ولا نعبد غیرك (ابن عباس) کو ر الضمیر للتنصیص علی انه المستعا به لا غیر (بیضاوی) یعنی ہم تیری عبادت کرتے ہیں اور تیرے سوا کسی اور کی عبادت نہیں کرتے اور مدد تجھ ہی سے طلب کرتے ہیں اور تیرے سوا کسی اور سے مدد طلب نہیں کرتے، یہ اور ان جیسی آیات پر جہلاء کی طرف سے ایک شبہ وارد کیا جاتا ہے جس کا ازالہ ضروری ہے شبہ کیا ہے؟ بیان یہ ہوا ہے کہ غیر اللہ سے مدد مانگنا، غیر اللہ کو نفع ونقصان کا مالک تصور کرنا اور غیر اللہ کو پکارنا شرک ہے حالانکہ ہمہ وقت ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ ہر انسان دوسرے انسان سے مدد مانگتا ہے، اور اسے اپنی مدد کے لئے پکارتا ہے اور اس سے مدد کی درخواست کرتا ہے یہ باہمی مدد مانگنے کا ثبوت بھی خود قرآن مجید میں موجود ہے۔ کیا ہم سب مشرک ہیں؟ کیا قرآن مجید میں متضاد احکام موجود ہیں؟ قرآن کا کونسا بیان صحیح ہے؟

ہمیں معلوم ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہود کی شرارت بھانپ لی اور سمجھ لیا کہ وہ کفر پر اڑ گئے ہیں تو اپنی مدد کے لئے پکارا، چنانچہ قرآن مجید میں ہے:

فَلَمَّاۤ اَحَسَّ عِیۡسٰی مِنۡهُمُ الۡکُفۡرَ قَالَ مَنۡ اَنۡصَارِیۡۤ اِلَی اللّٰهِ ؕ قَالَ الۡحَوَارِیُّوۡنَ نَحۡنُ اَنۡصَارُ اللّٰهِ (آل عمران ۳:۵۲)

''جب حضرت عیسیٰؑ نے محسوس کیا کہ بنی اسرائیل کفر وانکار پر آمادہ ہیں (اور وہ قتل کے درپے ہیں) تو ان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اللہ کی راہ میں میرا حامی اور مددگار کون ہے؟ حواری بولے کہ ہم اللہ کے دین کے بارے میں آپ کے مددگار ہیں''۔

ذوالقرنین نے یاجوج ماجوج کو روکنے کے لئے دیوار بناتے وقت لوگوں سے کہا: ''فَاَعِیۡنُوۡنِیۡ بِقُوَّةٍ'' (الکہف ۱۸:۴۱) سب مل کر قوم کے ساتھ میری مدد کرو، مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا: ''وَ اسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَ الصَّلٰوةِ ؕ'' (البقرہ:۴۵) صلوٰۃ اور صبر سے استعانت طلب کرو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وَّ الرَّسُوۡلُ یَدۡعُوۡکُمۡ فِیۡۤ اُخۡرٰىکُمۡ'' (آل عمران ۳: ۱۵۳) اور رسول اللہ ﷺ پیچھے سے تم کو پکار رہے تھے۔ یہ اور ان جیسی آیات کا مفہوم کیا ہوا؟

قرآن مجید میں جہاں یہود کی بہت سی شرارتوں کا ذکر کیا گیا ہے وہاں ان کی شرارت یہ بھی بیان کی گئی ہے ''یُحَرِّفُوۡنَ الۡکَلِمَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَوَاضِعِهٖ ۚ'' (المائدہ ۵:۴۱) ''یہ تورات کے کلموں کے باوجود یکہ ان کا صحیح محل ثابت ہو چکا ہے۔ صحیح محل سے پھیر دیتے ہیں''۔

یعنی ان کا مطلب کچھ سے کچھ بنا دیتے ہیں یہاں بھی وہی ہاتھ دکھایا گیا ہے اور صرف شرارتاً بات کہی گئی ہے ورنہ حقیت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ زیر نظر آیت کریمہ ''اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝'' کو ایک ساتھ ذکر کرنے کا مطلب ومفہوم ہی یہ تھا کہ اس استعانت کی بات ہے جو استعانت عبادت ہے اور یہ خالصۃً اللہ ہی سے ہے غیر اللہ سے نہیں۔

پھر اس کی مزید وضاحت بھی کی گئی ہے کہ ایک استعانت ماتحت الاسباب ہے یعنی ظاہری اسباب کے تحت کسی سے مدد مانگی جائے اور یہ امداد ہے جو تمام انسانوں کو روزمرہ زندگی میں ایک دوسرے سے حاصل ہوتی رہتی ہے اور ایک حد تک حاصل ہوتی ہی رہنی چاہیے کیونکہ یہ ایک دوسرے سے تعاون ہے جو نیکی کے ہر کام میں جاری رہنا چاہیے اور اس کا حکم تو خود اللہ تعالیٰ نے دیا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى ۪ وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ ۪ (مائدہ ۵:۲) ''نیکی اور بھلائی کے کاموں میں ایک دوسرے کا تعاون کیا کرو گناہ کے کام میں کسی سے تعاون نہ کرو''۔

شبہہ میں جس استعانت کا ذکر کیا گیا ہے اگر وہ عبادت ہوتی تو اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ العیاذ باللہ عوام الناس، اولیاء اللہ اور انبیاء علیہم السلام کے حاجت روا اور مشکل کشا ہیں کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریوں سے مدد مانگی اور ذوالقرنین نے اپنی قوم سے، حالانکہ جن لوگوں کی طرف سے شبہ پیش ہوا ان کا دعویٰ یہ ہے جسے وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ کہ انبیاء علیہم السلام اور اولیا کرام حاجت روا اور مشکل کشا ہیں معاذ اللہ۔

''مَنْ اَنْصَارِيْۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ'' کہہ کر عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ کیا تم میں کوئی ہے جو اللہ کے دین کے لئے میری امداد کرے؟ مطلب بالکل واضح ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ کے دین کے لئے تعاون کے لئے فرمایا تو حواریوں نے جواب دیا کہ ہم اللہ کے دین کے مددگار ہیں۔ یہ معاملہ تحت الاسباب تھا کیونکہ حواری عیسیٰ علیہ السلام کے پاس موجود تھے ان کی بات سن رہے تھے کہیں غائب نہ تھے۔ انہوں نے بالمشافہ حواریوں سے اسباب عادیہ کے تحت امداد طلب کی اور بالکل اسی طرح ذوالقرنین نے بھی یاجوج ماجوج کو روکنے کے لئے دیوار بناتے وقت لوگوں سے جو کہا تھا: ''فَاَعِيْنُوْنِيْ بِقُوَّةٍ'' ''تم قوت بازو یعنی کام کام سے میری مدد کرو''۔

یہ مدد بھی ظاہری اسباب کے تحت تھی۔ نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حواریوں کو غائبانہ پکارا اور نہ ان سے مافوق الاسباب مدد مانگی اور نہ ہی ذوالقرنین نے اپنی قوم سے ایسا کیا۔ جس طرح ظاہری اسباب کے تحت مدد وامداد جائز ہے اسی طرح اسباب عادیہ کے تحت پکار بھی جائز ہے یعنی جو آدمی سامنے موجود ہو اسے پکار کر یعنی اے فلاں کہہ کر کوئی ایسا کام کرنے کا کہا جائے جو اسباب عادیہ کے تحت اس کی قدرت میں ہو مثلاً اسے کہا جائے مجھے پانی پلا دو یا بازار سے سودا سلف لا دو تو یہ تعاون علی الخیر ہوا۔ دیکھو جنگ احد میں وقتی افراتفری کی بنا پر جب صحابہ کرامؓ کی کچھ تعداد آپ ﷺ سے علیحدہ ہو گئی تو آپ ﷺ نے ان کو واپس بلا لیا: وَّ الرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِيْۤ اُخْرٰىكُمْ (آل عمران ۳:۱۵۲) ''اور رسول اللہ ﷺ پیچھے سے تم کو بلا رہے تھے''۔

نبی کریم ﷺ کا یہ بلانا اور پکارنا اسباب ظاہری کے تحت تھا اور آواز ان کو دی جا رہی تھی جو میدان احد میں آپ ﷺ کی آواز سن رہے تھے یہ پکار ماتحت الاسباب تھی، نعوذ باللہ حضور ﷺ ان صحابہ کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھ کر نہیں پکار رہے تھے۔ فافہم فتدبر

اب خود ہی غور کر لو کہ ایک دوسرے سے مدد طلب کرے جبکہ ایک دوسرے کے سامنے ہو، ایک دوسرے کی بات کو سن رہا ہو، ایک دوسرے سے صرف اس کام میں مدد طلب کرے جس میں وہ اس کی مدد کر سکتا ہو تو یہ شریک کیونکر ہوا اور اس طرح ایک دوسرے کی مدد کرنے والے شریک کیسے ہو گئے؟

''وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى'' کا حکم دے کر قرآن مجید نے کس حکم خداوندی کے متضاد حکم دیا۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ۝۶

اے اللہ! ہم پر سعادت (24) کی سیدھی (25) راہ کھول دے (26)۔6

قرآن مجید کے وہ کون سے دو بیان ہیں جو آپس میں متضاد ہیں تاکہ یہ فیصلہ کیا جائے کہ کونسا حکم صحیح ہے اور کونسا صحیح نہیں؟
خوب سمجھ لو کہ یہ شبہ ڈالنے والے نے دھوکہ دیا، فریب کیا، مکاری کی، یہودیوں کا سا فعل کیا، دراصل یہ کوئی شبہ نہیں تھا خواہ مخواہ کی ایک مداخلت تھی، فریب نظر تھا جو کافور ہو گیا۔

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝۴ کے الفاظ ''نَعْبُدُ'' اور ''نَسْتَعِيْنُ'' جمع کا صیغہ ہے جو قابل لحاظ ہے کہ دعا تنہا ایک ایک فرد نہیں کر رہا۔ ایک ایک فرد کی زبان سے ساری ملت اسلامیہ مل کر اجتماعی رنگ میں کر رہی ہے اور یہ اجتماعیت کی اہمیت قرآن و حدیث دونوں کی دعاؤں میں کثرت سے جلوہ گر ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۱۲۷

ہدایت وہی ہدایت ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو:

24: اے اللہ! اهدنا تو ہم کو ہدایت دے۔ ''اهدنا'' کی اصل ھ د ی ہے۔ تو ہم کو راہ دکھا۔ تو ہم کو راہ بتلا۔ اهد ہدایۃ سے امر کا صیغہ واحد مذکر حاضر ''نا'' ضمیر جمع متکلم۔ اهدنا کا لفظ صرف دو بار قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے۔ ایک یہاں سورۂ فاتحہ میں اور ایک بار سورۂ ص کی آیت نمبر ۲۲ میں وَاهْدِنَآ اِلٰى سَوَآءِ الصِّرَاطِ ۝۲۲ اور کہیں یہ لفظ استعمال نہیں ہوا۔ ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝۵'' فاتحہ کی چھٹی آیت ہے۔

راہ ہدایت ہی راہ ''المستقیم'' ہے:

25: المستقیم کیا ہے؟ ''المستقیم'' کی اصل ق و م ہے۔ المستقیم۔ اسم فاعل واحد مذکر منصوب معرف باللام ''سیدھا'' ''سیدھی''۔ ''المستقیم'' کا لفظ قرآن مجید میں ۲۹ بار استعمال ہوا ہے۔

''پیغام نبوت'' کیا ہے؟ ہدایت ہی ہدایت ہے:

26: سعادت یعنی ''ہدایت'' کے معنی راہنمائی کرنے، راہ دکھانے اور راہ پر لگا دینے کے ہیں۔ ہدایت کے مختلف مراتب واقسام ہیں جن کا ذکر قرآن کریم نے کیا ہے اور ان اقسام ہدایت میں سے ایک خاص قسم کی ہدایت ''وحی و نبوت'' ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جس طرح مخلوقات کو ان کے مناسب حال جسم و قویٰ دیئے ہیں اسی طرح ان کی ہدایت کا فطری سامان بھی مہیا کر دیا ہے اور جس طرح مخلوقات کے مختلف مدارج ہدایت کے بھی مختلف مراتب حسب حال موجود ہیں۔ جس مخلوق کے لئے وجدان کی ہدایت کافی ہے وہ یقیناً اس میں موجود ہے وجدان کی ہدایت کیا ہے؟

وجدان طبیعت حیوانی کا فطری اور اندرونی الہام ہے ہم دیکھتے ہیں کہ ایک بچہ پیدا ہوتے ہی غذا کی تلاش کرتا ہے اور اس کی جستجو کے لئے اس کے پاس جب رونے کے سوا ابھی کوئی چیز نہیں ہے تو وہ رو رو کر ثابت کرتا ہے کہ اس کو احتیاج ہے لیکن ماں جب اس کو چھاتی سے لگاتی ہے تو وہ بغیر اس کے کہ خارج کی کوئی راہنمائی ملی ہو ماں کی چھاتی منہ میں لیتے ہی اسے چوستا ہے۔ اور اپنی غذا حاصل کر لیتا ہے۔

وجدان کے بعد حواس کی ہدایت کا مرتبہ ہے اور وہ وجدان سے بلند تر ہے یہ ہمیں دیکھنے، سننے، چکھنے، چھونے اور سونگنے کی قوتیں بخشتی

ہیں اور انہیں کے ذریعے ہم نفع حاصل کرتے اور نقصان سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہدایت فطرت کے یہ دونوں مرتبے انسان اور حیوان سب میں موجود ہیں لیکن جہاں تک انسان کا تعلق ہے ہم دیکھتے ہیں کہ اس میں ایک تیسرا مرتبہ ہدایت بھی موجود ہے اور وہ عقل کی ہدایت ہے۔ فطرت کی یہی وہ ہدایت ہے جس نے ایک انسان اور حیوان میں امتیاز پیدا کر دیا اور صرف یہی نہیں کہ امتیاز پیدا کیا بلکہ انسان کے سامنے غیر محدود ترقیات کا دروازہ کھول دیا ہے اور اس کو کائنات ارضی کی تمام مخلوقات کا حاصل و خلاصہ بنا دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ جوہر پہلی قسموں یعنی وجدان اور احساس سے قوی ہے۔ پھر جوہر عقل کیا ہے؟

عقل دراصل اس قوت کی ایک ترقی یافتہ حالت ہے جس نے حیوانات میں وجدان اور حواس کی روشنی پیدا کر دی تھی۔ جس طرح انسان کا جسم اجسام ارضی کی سب سے اعلیٰ کڑی ہے اسی طرح اس کی یہ معنوی قوت بھی تمام معنوی قوتوں کا برترین جوہر ہے۔ روح حیوانی کا وہ جوہر ادراک جو نباتات میں مخفی اور حیوانات کے وجدان میں نمایاں تھا۔ انسان کے مرتبے میں پہنچ کر درجہ کمال تک پہنچ گیا اور جوہر عقل کے نام سے موسوم ہوا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ہدایت فطرت کے ان تینوں مرتبوں یعنی وجدان، حواس اور عقل میں سے ہر مرتبہ اپنی قوت و عمل کا ایک خاص دائرہ رکھتا ہے اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اگر ایک مرتبے سے دوسرا مرتبہ بلند تر نہ ہوتا تو ہماری معنوی قوتیں اس حد تک ترقی نہ کر سکتیں جس حد تک فطرت کی راہنمائی سے ترقی کر رہی ہیں۔

وجدان کی ہدایت ہم میں طلب و سعی کا جوش پیدا کرتی ہے اور مطلوبات زندگی کی راہ پر لگا دیتی ہے لیکن ہمارے وجود سے باہر جو کچھ موجود ہے اس کا ادراک نہیں کر سکتی یہ کام مرتبہ حواس کی ہدایت کا ہے۔ وجدان کی راہنمائی جب درماندہ ہو جاتی ہے حواس کی دستگیری نمایاں ہوتی ہے، آنکھ دیکھتی ہے، کان سنتا ہے، زبان چکھتی ہے، ہاتھ چھوتا ہے اور ٹٹولتا ہے، ناک سونگھتی ہے اور اس طرح ہم اپنے وجود سے باہر کی تمام محسوس اشیاء کا ادراک حاصل کر لیتے ہیں۔

حواس کی ہدایت بھی ایک خاص حد تک ہی کام دے سکتی ہے اس سے آگے نہیں بڑھ سکتی آنکھ دیکھتی ہے، مگر صرف اسی حالت میں جب کہ دیکھنے کی تمام شرطیں موجود ہوں۔ اگر کوئی ایک شرط بھی نہ پائی جائے۔ مثلاً روشنی نہ ہو، فاصلہ زیادہ ہو تو ہم آنکھ رکھتے ہوئے بھی ایک موجود چیز کو براہ راست نہیں دیکھ سکتے۔ علاوہ ازیں حواس کی ہدایت صرف اتنا ہی کر سکتی ہے کہ اشیاء کا احساس پیدا کر دے ظاہر ہے کہ یہ مجرد احساس کافی نہیں ہے۔ ہمیں استنباط اور نتائج کی ضرورت ہے۔ احکام کی ضرورت ہے۔ کلیات کی ضرورت ہے اور یہ کام حواس کی ہدایت کا نہیں بلکہ یہ کام عقل کی ہدایت کا ہے۔

پھر جس طرح وجدان کی نگرانی کے لئے حواس کی ضرورت تھی اسی طرح حواس کی نگرانی کے لئے عقل کی ضرورت ہوئی۔ حواس کا ذریعہ ادراک نہ صرف محدود ہے بلکہ بسا اوقات غلطی و گمراہی سے بھی محفوظ نہیں۔ اگر مرتبہ حواس سے ایک بلند تر مرتبہ ہدایت کا موجود نہ ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ ہم حواس کی ان درماندگیوں میں حقیقت کا سراغ پا سکتے۔ ایسی تمام حالتوں میں عقل کی ہدایت نمودار ہوتی ہے وہ حواس کی درماندگیوں میں ہماری راہنمائی کرتی ہے لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ حق ہے اور ثابت ہے کہ عقل کی ہدایت بھی ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی اور اس کے دائرہ عمل کے بعد بھی ایک دائرہ باقی رہ جاتا ہے۔ عقل کی کارفرمائی اگرچہ کتنی ہی وسیع کیوں نہ ہو محسوسات کے دائرے میں محدود ہے یعنی وہ صرف اس حد تک کام دے سکتی ہے جس حد تک ہمارے حواس خمسہ معلومات بہم پہنچاتے ہیں لیکن محسوسات کی حد سے آگے کیا ہے؟

اس پردے کے پیچھے کیا ہے جس سے آگے ہماری چشم حواس نہیں بڑھ سکتی؟ جہاں پہنچ کر عقل درماندہ ہو جاتی ہے اس کی ہدایت ہمیں کوئی روشنی نہیں دے سکتی۔

ع 1/7

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝

وہ راہ جو ان لوگوں کی راہ ہوئی جن پر تُو نے (27) انعام کیا۔ ان (یہود) کی نہیں جو پھٹکارے (28) گئے اور نہ ان (29) (نصاریٰ) کی جو راہ سے بھٹک گئے (30)۔ 7

سورہ فاتحہ کی زیر نظر آیت اور اس جیسی قرآن کریم کی دوسری تمام آیات پکار پکار کر کہتی ہیں کہ اللہ نے تم کو وجدان کے ساتھ حواس بھی دیئے تا کہ وجدان کی لغزشوں میں نگرانی کریں اور حواس کے ساتھ عقل بھی دی تا کہ حواس کی غلطیوں میں قاضی و حاکم ہو تو عقل کے ساتھ وحی و نبوت کی ہدایت بھی دی تا کہ عقل کی درماندگیوں میں وہ راہنما اور فیصلہ کن ہو۔ اور اس کو قرآنی اصطلاح میں ''الہدیٰ'' کے نام سے پکارتا ہے۔

یہ ''الہدیٰ'' یعنی ہدایت ہدایت کی حقیقی راہ کون سی ہے؟ قرآن کہتا ہے وحی الٰہی کی عالمگیر ہدایت ہے جو اول دن سے دنیا میں موجود ہے اور بلا تفریق و امتیاز تمام نوع انسانی کے لئے ہے۔ وہ کہتا ہے جس طرح اللہ نے وجدان، حواس اور عقل کی ہدایت میں نہ تو نسل و قوم کا امتیاز رکھا نہ زمان و مکان کا۔ اسی طرح اس کی ہدایت وحی بھی ہر طرح کے تفرقے اور امتیاز سے پاک ہے۔ وہ سب کے لئے ہے اور سب کو دی گئی ہے اور اسی ایک ہدایت ''الھدیٰ'' کے سوا اور جتنی ہدایتیں بھی انسانوں نے سمجھ رکھی ہیں، سب انسانی بناوٹ کی راہیں ہیں۔ اللہ کی ٹھہرائی ہوئی راہ صرف یہی ایک راہ ہے۔

اسلئے وہ ہدایت کی ان تمام صورتوں سے یک قلم انکار کرتا ہے جو اس اصل سے منحرف ہو کر طرح طرح کی مذہبی گروہ بندیوں اور مخالف ٹولیوں میں بٹ گئی ہیں اور سعادت و نجات کی عالمگیر حقیقت خاص خاص گروہوں اور حلقوں کی میراث بنالی گئی ہے۔ وہ کہتا ہے انسانی بناوٹ کی یہ الگ الگ راہیں ہدایت کی راہ نہیں ہوسکتیں۔ ہدایت کی راہ تو وہی راہ ہے جو وحی و نبوت کے رنگ میں دی گئی جو کسی خاص گروہ قوم اور نسل کیلئے نہیں ہے بلکہ سب کے لئے یکساں ہے اور سب ہی کو اس کی طلب کرتے رہنا چاہیے۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝

انعام الٰہی کے اصل مستحق انبیاء شہداء اور صدیقین ہی ہیں:

27: تو نے انعام کیا۔ ''انعمت'' تو نے فضل کیا۔ تو نے احسان کیا۔ اس کی ''اصل'' ن ع م ہے اور انعمت انعام سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر حاضر ہے اور قرآن مجید میں انعمت کا لفظ آٹھ بار استعمال ہوا ہے۔

غضب الٰہی سے پناہ طلب کرتے رہنا چاہیے:

28: ''المغضوب'' کی ''اصل'' غ ض ب۔ غضب، سخت غصہ، بہت غصہ ہونا، انتقام کے لئے دل کے خون میں جوش آ کر گردن کی رگیں پھول جانا اور آنکھیں سرخ ہو جانا۔ گویا بدن کے اندر ایک آگ بھڑک جانا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت ہو تو اس سے مراد ہے۔ سخت عذاب دینا، المغضوب جن پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوا۔ غیر المغضوب یعنی جن لوگوں پر اللہ تعالیٰ کے غصہ یعنی عذاب نازل نہ ہوا۔ اور المغضوب صرف ایک بار استعمال ہوا ہے جو یہاں سورۂ فاتحہ کی ساتویں آیت میں ہے اور اس کے علاوہ یہ لفظ قرآن مجید میں کہیں نہیں آیا۔ '' صِرَاطَ الَّذِيْنَ '' سے آخر تک فاتحہ کی ساتویں آیت ہے۔

''ضال'' کے ایک معنی بھول جانے کے بھی اور ایک تلاش کرنے کے بھی:

29: ''الضالین'' کی ''اصل'' ض ل ل ہے۔ اور ''ضال'' کے معنی سیدھی راہ سے ہٹ جانے کے ہیں۔ اگر چہ یہ لفظ بہت سے معنوں

میں استعمال ہوتا ہے۔ بھول جانے، سہو ہو جانے اور نسیان ہونے یعنی ناواقف حیران اور بے خبر کے معنوں میں جو انسان کی اختیاری حالت نہیں ہوتی۔ اگر اختیار کے ساتھ ہو تو برا ہے اور بھول چوک ہو تو معاف ہے۔ بعض اوقات ہدایۃ کی ضد میں اس کا استعمال ہوتا ہے جو ایک برا وصف ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: ''مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۭ''۔

بہر حال مختصر یہ ہے کہ راہ سے ہٹنا مراد ہے قصداً ہو یا سہواً، اگر اس کی نسبت شیطان، کافر اور فاسق کی طرف ہوگی تو یقیناً رشد و ہدایت کی ضد ہی میں استعمال ہوگا لیکن اگر اس کی نسبت کسی نیک انسان اور نبی کی طرف ہوگی تو اس سے مراد نسیان و سہو اور بھول چوک ہوگا جو ایک وقتی چیز ہوتی ہے دائمی گمراہی نہیں، اور ''الضالین'' کا لفظ قرآن مجید میں صرف چھ بار استعمال ہوا ہے سورۂ فاتحہ کی ساتویں آیت میں۔ البقرہ کی آیت ۱۹۸ میں، الانعام کی آیت ۷۷ میں، شعراء کی آیت نمبر ۲۰، ۸۶ میں اور واقعہ کی آیت ۹۲ میں۔ ان سب جگہوں میں اس کا استعمال غیر المہتدین پر ہی ہوا ہے۔

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں آپ پڑھ چکے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ عقل کی ہدایت نہ تو ہر حال میں کافی ہے، نہ ہر حال میں مؤثر، ذرا مزید غور کرو کہ نفس انسانی طرح طرح کی خواہشوں اور جذبوں سے کچھ اس طرح مقہور واقعہ ہوا ہے کہ جب کبھی عقل اور جذبات میں کشمکش ہوتی ہے تو اکثر حالتوں میں فتح جذبات ہی کی ہوتی ہے۔ بسا اوقات عقل ہمیں یقین دلاتی ہے کہ فلاں فعل مضر اور مہلک ہے لیکن جذبات ہمیں ترغیب دیتے ہیں اور ہم اس مضر فعل کے ارتکاب سے اپنے آپ کو روک نہیں سکتے۔ عقل کی بڑی سے بڑی دلیل بھی ہمیں ایسا نہیں بنا سکتی کہ غصے کی حالت میں بے قابو نہ ہو جائیں اور بھوک کی حالت میں مضر غذا کی طرف ہاتھ نہ بڑھائیں۔ ان اشارات کو جتنی وسعت دیتے جاؤ گے بات صاف ہوتی جائے گی۔

جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا کہ حواس کی ہدایت ذرا ماند ہوئی تو عقل کی ہدایت نے اس کو درماندگی سے بچا لیا اور جب یہ بات واضح ہو گئی کہ عقل کی ہدایت بھی ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی تو کیا ضروری نہ تھا کہ عقل کی ہدایت کے ساتھ کوئی اور ہدایت بھی ہوتا کہ عقل کی درماندگیوں میں وہ راہنما ہو سکے؟

قرآن کریم کہتا ہے کہ ضروری تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے عقل کی ہدایت کی درماندگیوں سے بچانے کے لئے ایک اور ہدایت کا بندوبست فرمایا جس کو ''وحی و نبوت کی ہدایت'' سے تعبیر کیا جاتا ہے اور کتاب ہدایت کا ورق الٹتے ہی اور نیاز مندانہ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے ہی ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝'' کی طلب کا حکم دے کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ انسان کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنی دعا میں اس ہدایت کی طلب ہمیشہ کرتا رہے، تاکہ عقل کی ہدایت جب ماند پڑ جائے تو وحی ہدایت اس کی راہنمائی کے لئے تیار ہو۔

انعام یافتہ لوگوں کی راہ اللہ سے طلب کرتے رہنا چاہئے:

30: یہ اس سیدھے راستہ کی تعریف ہے جس کے لئے ہم ہاتھ باندھے نیاز مندانہ کھڑے ہو کر طلب کر رہے ہیں۔ یعنی وہ راستہ جس پر ہمیشہ سے تیرے منظور نظر لوگ چلتے رہے۔ وہ بے خطا راستہ کے قدیم ترین زمانہ سے آج تک جو شخص اور جو گروہ بھی اس پر چلا وہ تیرے انعامات کا مستحق ہوا اور تیری نعمتوں سے مالا مال ہو گیا۔ رہی یہ بات کہ انعام یافتہ کون لوگ ہیں جن کی راہ سیدھی ہوئی؟ قرآن مجید نے جا بجا واضح کیا ہے کہ خدا کے تمام رسول اور راست باز انسان جو دنیا کے مختلف عہدوں اور گوشوں میں گزر چکے ہیں سب انعام یافتہ انسان ہیں اور انہی کی راہ ''صراط مستقیم'' ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰۗىِٕكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاۗءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَ

حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿۶۹﴾ (النساء ۴:۶۹)

''اور جس کسی نے اللہ اور رسول کی اطاعت کی تو بلاشبہ وہ ان لوگوں کا ساتھی ہوا جن پر اللہ نے انعام کیا ہے یہ انعام یافتہ جماعت نبیوں کی ہے صدیقوں کی ہے۔ شہداء کی ہے۔ نیک عمل انسانوں کی ہے اور جس کے ساتھی ایسے لوگ ہوں تو کیا ہی اچھی اس کی رفاقت ہے''۔

اس آیت میں بالترتیب چار جماعتوں کا ذکر کیا گیا ہے اور انہیں انعام یافتہ قرار دیا گیا ہے۔ انبیاء، صدیقین شہداء اور صالحین۔

''انبیاء'' سے مقصود خدا کی سچائی کے تمام پیغمبر ہیں جو نوعِ انسانی کی ہدایت کے لئے پیدا ہوئے۔

''صدیقین'' سے مقصود ایسے انعام یافتہ ہیں جو کامل معنوں میں سچے ہوں یعنی سچائی کے سانچے میں کچھ ایسے ڈھلے ہوئے ہوں کہ سچائی کے خلاف کوئی بات ان کے دماغ میں اتر ہی نہ سکے۔

''شہید'' کے معنی گواہ کے ہیں یعنی ایسے انسان جو اپنے قول و فعل سے حق و صداقت کی شہادت بلند کرنے والے ہوں۔

''صالحین'' سے مقصود وہ تمام انسان ہیں جو نیک عملی کی راہ میں استقامت رکھیں اور برائی کی راہوں سے کنارہ کش ہوں۔

پس معلوم ہوا کہ انعام یافتہ انسانوں سے مقصود دنیا کے تمام رسول اور داعیان حق ہیں جو قرآن مجید کے نزول سے پہلے دنیا میں پیدا ہو چکے تھے اور تمام راست باز انسان وہ ہیں جو نوعِ انسانی میں گزر چکے تھے۔ اس میں نہ تو کوئی خاص نسل و قوم کی خصوصیت رکھی گئی ہے نہ کسی خاص مذہب اور اس کے پیرووں کی۔ دنیا کے تمام نبی، تمام صدیق، تمام شہداء، تمام صالح انسان خواہ وہ کسی ملک و قوم میں ہوئے ہوں قرآن کریم کے نزدیک ''انعام یافتہ'' انسان ہیں اور انہی کی راہ ''صراط مستقیم'' ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ خدا کے ان رسولوں اور نوع انسان کے راستباز افراد کی راہ کونسی راہ تھی؟ وہ راہ جسے قرآن دین حقیقی کی راہ قرار دیتا ہے وہ کہتا ہے دنیا میں جس قدر بھی سچائی کے داعی آئے، سب نے یہی تعلیم دی کہ: '' اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَ لَا تَتَفَرَّقُوْا ''، یعنی خدا کا ایک ہی دین قائم رکھو اور اس راہ میں جدا جدا نہ ہو جاؤ۔

پس ''صراط مستقیم'' پر چلنے کی طلب زندگی کی تمام راہوں میں درستگی و صحت کی راہ چلنے کی طلب ہوئی اور اس لئے سعی و عمل کے ہر گوشے میں انعام یافتہ گروہ وہی ہو سکتا ہے جس کی راہ ''صراط مستقیم'' ہو۔

صراط مستقیم کی پہچان کے دونوں پہلو واضح کر دیئے

پھر صراط مستقیم کی پہچان صرف اس کے مثبت پہلو ہی سے واضح نہیں کی گئی بلکہ اس کا ضد و مخالف پہلو بھی واضح کر دیا گیا ہے ''غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ ﴿۷﴾ ''ان کی راہ نہیں جو مغضوب ہوئے نہ ان کی جو گمراہ ہو کر بھٹک گئے''۔

''مغضوب علیہ'' گروہ ''منعم علیہ'' کی بالکل ضد ہے کیونکہ انعام کی ضد غضب ہے اور فطرت کائنات کا قانون یہ ہے کہ راست باز انسانوں کے حصہ میں انعام آتا ہے۔ نافرمانوں کے حصے میں غضب ''گمراہ'' وہ ہیں جو راہ حق نہ پا سکے اور اس کی جستجو میں بھٹک گئے۔ پس مغضوب وہ ہوئے جنہوں نے راہ پائی اور اس کی نعمتیں بھی پائیں لیکن پھر اس سے منحرف ہو گئے اور نعمت کی راہ چھوڑ کر محرومی و شقاوت کی راہ اختیار کر لی، گمراہ وہ ہوئے جو راہ ہی نہ پا سکے اس لئے ادھر ادھر بھٹک کر رہ گئے اور صراط مستقیم کی سعادتوں سے محروم رہے۔ یعنی ''مغضوب علیہ'' کی محرومی حصول معرفت کے بعد انکار کا نتیجہ ہے اور گمراہ کی محرومی جہل کا نتیجہ ہے۔ ظاہر ہے کہ محروم دونوں ہی ہوئے مگر یہ ظاہر ہے کہ پہلے کی محرومی زیادہ مجرمانہ ہے۔

احادیث واثار میں اس کی حقیقت واضح کردی گئی

احادیث وآثار میں اس کی جو تفسیر بیان کی گئی ہے۔ اس سے یہ حقیقت اور زیادہ واضح ہوجاتی ہے۔ ترمذی، احمد، ابن حبان وغیرہم کی مشہور حدیث ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''المغضوب'' یہودی اور ''الضالین'' نصاریٰ ہیں۔ یقیناً اس تفسیر کا یہ مطلب نہیں ہوسکتا کہ مغضوب سے مقصود صرف یہودی اور گمراہ سے مقصود صرف نصاریٰ ہیں۔ بلکہ مقصود یہ ہے کہ مغضوبیت اور گمراہی کی حالت واضح کرنے کے لئے دو جماعتوں کا ذکر بطور مثال کردیا جائے۔ چنانچہ ان دونوں جماعتوں کی تاریخ میں ہم محرومی کی دونوں حالتوں کا کامل نمونہ آج بھی دیکھ سکتے ہیں۔ یہودیوں کی قومی تاریخ مغضوبیت کے لئے عیسائیوں کی تاریخ گمراہی کے لئے عبرت وتذکرہ کا بہترین سرمایہ ہے۔ ذرا تاریخ کی ورق گردانی کرکے دیکھیں کہ وہ کیا تھے؟ اور کیا ہوگئے۔

ہم دیکھتے ہیں، قرآن مجید نے ہدایت وتذکیر امم کے لئے جن جن اصولوں پر زور دیا ہے ان میں سب سے زیادہ نمایاں اصل پچھلی قوموں کے ایام ووقائع اور ان کے نتائج ہیں۔ وہ کہتا ہے کائنات ہستی کے گوشے کی طرح قوموں اور جماعتوں کے لئے بھی خدا کا قانون سعادت وشقاوت ایک ہی ہے اور ہر عہد اور ہر ملک میں ایک ہی طرح کے احکام ونتائج رکھتا ہے اس کے احکام میں کبھی تبدیلی نہیں ہوسکتی اور اس کے نتائج ہمیشہ اور ہر حال میں اٹل ہیں جس طرح سنکھیا کی تاثیر اس لئے بدل نہیں سکتی کہ وہ کس عہد اور کس سنہ میں استعمال کی گئی اس طرح قوموں اور جماعتوں کے اعمال کے نتائج بھی اس لئے متغیر نہیں ہوسکتے کہ کس ملک میں پیش آئے۔ اگر ماضی میں ہمیشہ شہد، شہد ہی کا خاصہ رکھتا آیا ہے اور سنکھیا کی تاثیر سنکھیا ہی کی رہی ہے تو مستقبل میں بھی ہمیشہ شہد، شہد ہی رہے گا اور سنکھیا کی تاثیر سنکھیا ہی کی ہوگی۔ پس جو کچھ ماضی میں پیش آچکا ہے ضروری ہے کہ مستقبل میں بھی پیش آئے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ﴿٦٢﴾ (۳۳:۶۲)

''جو لوگ تم سے پہلے گزر چکے ہیں ان کے لئے اللہ کی سنت یہی رہی یعنی اللہ کے قوانین واحکام کا دستور یہی رہا ہے اور اللہ کی سنت میں تم کبھی ردوبدل نہیں پاؤ گے۔'' ایک جگہ ارشاد ہوا:

فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ ۚ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ﴿٤٣﴾

(فاطر ۳۵:۴۳)

''پھر یہ لوگ کس بات کی راہ تک رہے ہیں؟ کیا اس سنت کی جو اگلے لوگوں کے لئے رہ چکی ہے؟ تو یاد رکھو، تم اللہ کی سنت کو کبھی بدلتا ہوا نہیں پاؤ گے اور نہ کبھی ایسا ہوسکتا ہے کہ اس کی سنت کے احکام پھیر دیئے جائیں۔'' ایک جگہ ارشاد ہے:

سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا ﴿٧٧﴾ (بنی اسرائیل ۱۷:۷۷)

''اے پیغمبر ﷺ! تم سے پہلے جن رسولوں کو ہم نے بھیجا ہے، ان کیلئے ہماری سنت یہی رہی ہے اور ہماری سنت کبھی ٹلنے والی نہیں ہے۔''

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ایک طرف تو انعام یافتہ جماعتوں کی کامرانیوں کا ذکر بار بار کرتا ہے اور دوسری طرف مغضوب اور گمراہ جماعتوں کی محرومیوں کی سرگزشتیں بھی بار بار سناتا ہے پھر جابجا ان سے عبرت وبصیرت کے نتائج اخذ کرتا ہے جن پر اقوام وجماعات کا عروج وزوال موقوف ہے۔ وہ کھول کھول کر بتاتا ہے کہ انعام یافتہ جماعتوں کی سعادت وکامرانی ان کے اعمال کا انعام تھی اور مغضوب وگمراہ جماعتوں کی شقاوت ومحرومی ان کی بدعملیوں کی پاداش تھی۔ وہ اچھے نتائج کو ''انعام'' کہتا ہے کیونکہ وہ فطرت الٰہی کی قبولیت ہے۔ برے نتائج کو ''غضب'' کہتا ہے کیونکہ یہ قانون الٰہی کی پاداش ہے۔ وہ کہتا ہے جن اسباب وعمل سے دس مرتبہ ایک خاص طرح کا معلول پیدا ہوچکا ہے

تم کیونکر انکار کر سکتے ہو، کہ گیارہویں مرتبہ بھی ویسا ہی معلول پیدا نہ ہوگا؟

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۙ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۳۷﴾ (آل عمران ۳: ۱۳۷)

''تم سے پہلے بھی دنیا میں خدا کے احکام وقوانین کے نتائج گزر چکے ہیں پس ملکوں کی سیر کرو اور دیکھو ان لوگوں کا انجام کیا ہوا جنہوں نے اللہ کے احکام وقوانین کو جھٹلایا تھا''

قرآن مجید کی سورتوں میں ایک بڑی تعداد انہی سورتوں کی ہے جو تمام تر اس مطلب پر مشتمل ہیں کہا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید میں جس قدر بیان بھی پچھلے عہدوں کے وقائع وقصص کا ہے وہ تمام تر سورۂ فاتحہ کی اس آیت کی تفصیل ہے

سورۂ فاتحہ کی تعلیمی روح کا خلاصہ

اچھا! اب چند لمحوں کے لئے سورہ فاتحہ کے مطالب پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالو اور دیکھو اسی کی سات آیتوں کے اندر مذہبی عقائد وتصور کی جو روح مضمر ہے وہ کس طرح کی ذہنیت پیدا کرتی ہے۔ سورۃ فاتحہ ایک دعا ہے۔ فرض کرو ایک انسان کے دل زبان سے شب و روز یہی دعا نکلتی رہتی ہے۔ اس صورت میں اس کے فکر واعتقاد کا کیا حال ہوگا؟

وہ خدا کی حمد وثنا میں زمزمہ سنج ہے، لیکن اس خدا کی حمد میں نہیں جو نسلوں، قوموں اور مذہبی گروہ بندیوں کا خدا ہے بلکہ ''ربّ العٰلمین'' کی حمد میں جو تمام کائنات خلقت کا پروردگار ہے اور اس لئے تمام نوع انسانی کے لئے یکساں طور پر پروردگاری ورحمت رکھتا ہے۔ پھر وہ اسے اس کی صفتوں کے ساتھ پکارنا چاہتا ہے لیکن اس کی تمام صفتوں میں سے صرف رحمت اور عدالت ہی کی صفتیں اسے یاد آتی ہیں۔ گویا خدا کی ہستی کی نمود اس کے لئے سرتاسر رحمت وعدالت کی نمود ہے اور جو کچھ بھی اس کی نسبت جانتا ہے وہ رحمت وعدالت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ پھر وہ اپنا سر نیاز جھکاتا اور اس کی عبودیت کا اقرار کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ صرف تیری ہی ایک ذات ہے جس کے آگے بندگی و نیاز کا سر جھک سکتا ہے اور صرف تو ہی ہے جو ہماری ساری درماندگیوں اور احتیاجوں میں مددگاری کا سہارا ہے۔ وہ اپنی عبادت اور استعانت دونوں کو صرف ایک ہی ذات کے لئے وابستہ کر دیتا ہے اور اس طرح دنیا کی ساری قوتوں اور ہر طرح کی انسانی فرمانروائیوں سے بے پروا ہو جاتا ہے۔ اب کسی چوکھٹ پر اس کا سر جھک نہیں سکتا۔ اب کسی قوت سے وہ ہراساں نہیں ہو سکتا۔ اب کسی کے آگے اس کا دست طلب دراز نہیں ہو سکتا۔

پھر وہ خدا سے سیدھی راہ چلنے کی توفیق طلب کرتا ہے۔ یہی ایک دعا ہے جس سے زبان احتیاج آشنا ہوتی ہے، لیکن کون سی سیدھی راہ؟ نہیں، وہ راہ جو دنیا کے تمام مذہبی راہنماؤں اور تمام راستباز انسانوں کی متفقہ راہ ہے، خواہ کسی عہد اور کسی قوم میں ہوئے ہوں۔ کسی خاص نسل کی سیدھی راہ؟ کسی خاص قوم کی سیدھی راہ؟ کسی خاص حلقے کی سیدھی راہ؟ اس طرح وہ محرومی اور گمراہی کی راہوں سے پناہ مانگتا ہے لیکن یہاں بھی کسی خاص نسل وقوم یا کسی خاص مذہبی گروہ کا ذکر نہیں کرتا بلکہ ان راہوں سے بچنا چاہتا ہے جو دنیا کے تمام محروم اور گمراہ انسانوں کی راہیں رہ چکی ہیں۔ گویا جس بات کا طلب گار ہے وہ بھی نوع انسانی کی عالمگیر اچھائی ہے اور جس بات سے پناہ مانگتا ہے وہ بھی نوع انسانی کی عالمگیر برائی ہے۔ نسل، قوم، ملک یا مذہبی گروہ بندی کے تفرقہ وامتیاز کی کوئی پرچھائیں اس کے دل ودماغ پر نظر نہیں آتی۔

غور کرو! مذہبی تصور کی یہ نوعیت انسان کے ذہن وعواطف کے لئے کس طرح کا سانچہ مہیا کرتی ہے؟ جس انسان کا دل ودماغ ایسے سانچے میں ڈھل کر نکلے گا وہ کس قسم کا انسان ہوگا؟ کم از کم دو باتوں سے تم انکار نہیں کر سکتے ایک یہ کہ اس کی خدا پرستی خدا کی عالمگیر رحمت و جمال کے تصور کی خدا پرستی ہوگی۔ دوسری یہ کہ کسی معنی میں بھی نسل وقوم یا گروہ بندیوں کا انسان نہیں ہوگا۔ عالمگیر انسانیت کا انسان ہوگا اور دعوت قرآنی کی اصل روح یہی ہے۔ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ﴿۸۸﴾

اختصارِ فاتحہ پر ایک نظر مزید

غور کریں کہ اسلام جو تہذیب انسان کو سکھاتا ہے اس کے قواعد میں سے ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنے ہر کام کی ابتدا اللہ کے نام سے کرے۔ اس قاعدے کی پابندی اگر شعور اور خلوص کے ساتھ کی جائے تو اس سے لازماً تین فائدے حاصل ہوں گے۔ ایک یہ کہ آدمی بہت سے برے کاموں سے بچ جائے گا، کیونکہ اللہ کا نام لینے کی عادت اسے ہر کام شروع کرتے وقت یہ سوچنے پر مجبور کر دے گی کہ کیا واقعی میں اس کام پر اللہ کا نام لینے میں حق بجانب ہوں؟ دوسرے یہ کہ جائز اور صحیح اور نیک کاموں کی ابتداء کرتے ہوئے اللہ کا نام لینے سے آدمی کی ذہنیت بالکل ٹھیک سمت اختیار کر لے گی اور وہ ہمیشہ صحیح ترین نقطہ سے اپنی حرکت کا آغاز کرے گا۔ تیسرا اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ جب وہ اللہ کے نام سے اپنا کام شروع کرے گا تو اللہ کی تائید اور توفیق اس کو شامل حال ہوگی، اس کی سعی میں برکت ڈالی جائے گی اور شیطان کی فساد انگیزیوں سے اس کو بچایا جائے گا۔ اللہ کا طریقہ یہ ہے کہ جب بندہ اس کی طرف توجہ کرتا ہے تو وہ بھی بندے کی طرف توجہ فرماتا ہے۔

معلوم ہوگا جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں سورۂ فاتحہ اصل میں تو ایک دعا ہے، لیکن دعا کی ابتدا اس ہستی کی تعریف سے کی جا رہی ہے جس سے ہم دعا مانگنا چاہتے ہیں۔ یہ گویا اس امر کی تعلیم ہے کہ دعا جب مانگو تو مہذب طریقہ سے مانگو۔ یہ کوئی تہذیب نہیں ہے کہ منہ کھولتے ہی جھٹ اپنا مطلب پیش کر دیا۔ تہذیب کا تقاضا یہ ہے کہ جس سے دعا کر رہے ہو، پہلے اس کی خوبی کا، اس کے احسانات اور اس کے مرتبے کا اعتراف کرو۔ تعریف ہم جس کی بھی کرتے ہیں، دو وجوہ سے کیا کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ بجائے خود حسن و خوبی اور کمال رکھتا ہو، قطع نظر اس سے کہ ہم پر اس کے ان فضائل کا کیا اثر ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ ہمارا محسن ہو اور ہم اعتراف نعمت کے جذبہ سے سرشار ہو کر اس کی خوبیاں بیان کریں۔ اللہ تعالیٰ کی تعریف ان دونوں حیثیتوں سے ہے۔ یہ ہماری قدر شناسی کا تقاضا بھی ہے اور احسان شناسی کا تقاضا بھی کہ ہم اس کی تعریف میں رطب اللسان ہوں۔

اور بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ تعریف اللہ کے لئے ہے، بلکہ صحیح یہ ہے کہ ''تعریف اللہ ہی'' کے لئے ہے۔ یہ بات کہہ کر ایک بڑی حقیقت پر سے پردہ اٹھایا گیا ہے اور وہ حقیقت ایسی ہے جس کی پہلی ہی ضرب سے مخلوق پرستی کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ دنیا میں جہاں جس چیز اور جس شکل میں بھی کوئی حسن کوئی خوبی، کوئی کمال ہے، اس کا سرچشمہ اللہ ہی کی ذات ہے۔ کسی انسان، کسی فرشتے، کسی دیوتا، کسی سیارے، غرض کسی مخلوق کا کمال بھی ذاتی نہیں ہے بلکہ اللہ کا عطیہ ہے۔ پس اگر کوئی اس کا مستحق ہے کہ ہم اس کے گرویدہ اور پرستار، احسان مند اور شکر گزار، نیاز مند اور خدمت گار بنیں تو وہ خالق کا کمال ہے نہ کہ صاحب کمال۔

یاد رہے کہ ربّ کا لفظ عربی زبان میں تین معنوں میں بولا جاتا ہے: (1) مالک اور آقا (2) مربی، پرورش کرنے والا، خبر گیری اور نگہبانی کرنے والا (3) فرمانروا، حاکم، مدبر اور منتظم۔ اللہ تعالیٰ ان سب معنوں میں کائنات کا ربّ ہے۔

دیکھئے انسان کا خاصہ ہے کہ جب کوئی چیز اس کی نگاہ میں بہت زیادہ ہوتی ہے تو وہ مبالغہ کے صیغوں میں اس کو بیان کرتا ہے، اور اگر ایک مبالغہ کا لفظ بول کر وہ محسوس کرتا ہے کہ اس شے کی فراوانی کا حق ادا نہیں ہوا، تو پھر وہ اس معنی کا ایک اور لفظ بولتا ہے تاکہ وہ کمی پوری ہو جائے جو اس کے نزدیک مبالغہ میں رہ گئی ہے۔ اللہ کی تعریف میں رحمٰن کا لفظ استعمال کرنے کے بعد پھر رحیم کا اضافہ کرنے میں بھی یہی نکتہ

پوشیدہ ہے۔ رحمان عربی زبان میں بڑے مبالغے کا صیغہ ہے۔ لیکن اللہ کی رحمت اور مہربانی اپنی مخلوق پر اتنی زیادہ ہے، اس قدر وسیع ہے، ایسی بے حد و بے حساب ہے کہ اس کے بیان میں بڑے سے بڑے مبالغہ کا لفظ بول کر بھی جی نہیں بھرتا۔ اس لئے اس کی فراوانی کا حق ادا کرنے کے لئے پھر رحیم کا لفظ مزید استعمال کیا گیا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ہم کسی شخص کی فیاضی کے بیان میں ''سخی'' کا لفظ بول کر جب تشنگی محسوس کرتے ہیں تو اس پر ''داتا'' کا اضافہ کرتے ہیں۔ رنگ کی تعریف میں جب ''گورے'' کو کافی نہیں پاتے تو اس پر ''چٹے'' کا لفظ اور بڑھا دیتے ہیں۔ درازی قد کے ذکر میں جب ''لمبا'' کہنے سے تسلی نہیں ہوتی تو اس کے بعد ''تڑنگا'' بھی کہتے ہیں۔

روز جزا یعنی اس دن کا مالک جب کہ تمام اگلی پچھلی نسلوں کو جمع کر کے ان کے کارنامہ زندگی کا حساب لیا جائے گا اور ہر انسان کو اس کے عمل کا پورا صلہ یا بدلہ مل جائے گا۔ اللہ کی تعریف میں رحمان اور رحیم کہنے کے بعد مالک روز جزا کہنے سے یہ بات نکلتی ہے کہ وہ نرا مہربان ہی نہیں ہے بلکہ منصف بھی ہے، اور منصف بھی ایسا با اختیار منصف کہ آخری فیصلے کے روز وہی پورے اقتدار کا مالک ہوگا۔ نہ اس کی سزا میں کوئی مزاحم ہو سکے گا اور نہ جزا میں مانع۔ لہٰذا ہم اس کی ربوبیت اور رحمت کی بنا پر اس سے محبت ہی نہیں کرتے بلکہ اس کے انصاف کی بنا پر اس سے ڈرتے بھی ہیں اور یہ احساس بھی رکھتے ہیں کہ ہمارے انجام کی بھلائی اور برائی بالکلیہ اس کے اختیار میں ہے۔

اسی طرح عبادت کا لفظ بھی عربی زبان میں تین معنوں میں استعمال ہوتا ہے: (1) پوجا اور پرستش، (2) اطاعت اور فرمانبرداری، (3) بندگی اور غلامی۔ اس مقام پر تینوں معنی بیک وقت مراد ہیں۔ یعنی ہم تیرے پرستار بھی ہیں، مطیع فرمان بھی اور بندہ و غلام بھی اور بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ ہم تیرے ساتھ یہ تعلق رکھتے ہیں۔ بلکہ واقعی حقیقت یہ ہے کہ ہمارا یہ تعلق صرف تیرے ہی ساتھ ہے۔ ان تینوں معنوں میں سے کسی معنی میں بھی کوئی دوسرا ہمارا معبود نہیں ہے۔

اے ہمارے اللہ تیرے ساتھ ہمارا تعلق محض عبادت ہی کا نہیں ہے بلکہ استعانت کا تعلق بھی ہم تیرے ہی ساتھ رکھتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ ساری کائنات کا ربّ تو ہی ہے اور ساری طاقتیں تیرے ہی ہاتھ میں ہیں، اور ساری نعمتوں کا تو ہی اکیلا مالک ہے، اس لئے ہم اپنی حاجتوں کی طلب میں تیری طرف ہی رجوع کرتے ہیں، تیرے ہی آگے ہمارا ہاتھ پھیلتا ہے اور تیری مدد ہی پر ہمارا اعتماد ہے۔ اسی بنا پر ہم اپنی یہ درخواست لے کر تیری خدمت میں حاضر ہو رہے ہیں۔

اے ربّ کریم! زندگی کے ہر شعبہ میں خیال اور عمل اور برتاؤ کا وہ طریقہ ہمیں بتا جو بالکل صحیح ہو، جس میں غلط بینی اور غلط کاری اور بد انجامی کا خطرہ نہ ہو، جس پر چل کر ہم سچی فلاح و سعادت حاصل کر سکیں۔ یہ ہے وہ درخواست جو قرآن کے مطالعہ شروع کرتے ہوئے بندہ اپنے اللہ کے حضور پیش کرتا ہے۔ اس کی گزارش یہ ہے کہ آپ ہماری راہنمائی فرمائیں اور ہمیں بتائیں کہ قیاسی فلسفوں کی ان بھول بھلیوں میں حقیقت نفس الامری کیا ہے، اخلاق کے ان مختلف نظریات میں صحیح نظام اخلاق کونسا ہے، زندگی کی ان سے بے شمار بگڈنڈیوں کے درمیان فکر و عمل کی سیدھی اور صاف شاہراہ کونسی ہے؟

''انعام یافتہ'' اس سیدھے راستہ کی تعریف ہے جس کا علم ہم اللہ تعالیٰ سے مانگ رہے ہیں۔ یعنی وہ راستہ جس پر ہمیشہ سے تیرے منظور نظر لوگ چلتے رہے ہیں۔ وہ بے خطا راستہ کہ قدیم ترین زمانہ سے آج تک جو شخص اور جو گروہ بھی اس پر چلا وہ تیرے انعامات کا مستحق ہوا اور تیری نعمتوں سے مالا مال ہو کر رہا۔ نہ وہ بھولا اور نہ بھٹکا، اس لیے ہم بھول جانے اور بھٹک جانے سے بھی تیری پناہ میں آنا چاہتے ہیں تا کہ ان بھولنے والوں اور بھٹکنے والوں میں شمار نہ ہوں۔ اللھم یسر و لا تعسر و تم بالخیر۔

اے منعم حقیقی ''انعام'' پانے والوں سے ہماری مراد وہ لوگ نہیں ہے جو بظاہر عارضی طور پر تیری دنیوی نعمتوں سے سرفراز تو ہوتے ہیں

مگر دراصل وہ تیرے غضب کے مستحق ہوا کرتے ہیں اور اپنی فلاح وسعادت کی راہ گم کئے ہوئے ہوتے ہیں۔اس سلبی تشریح سے یہ بات خود کھل جاتی ہے کہ ''انعام'' سے ہماری مراد حقیقی اور پائیدار انعامات ہیں جو راست روی اور اللہ کی خوشنودی کے نتیجہ میں ملا کرتے ہیں، نہ کہ وہ عارضی اور نمائشی انعامات جو پہلے بھی فرعونوں، نمرودوں اور قارونوں کو ملتے رہے ہیں اور آج بھی ہماری آنکھوں کے سامنے بڑے بڑے ظالموں اور بدکاروں اور گمراہوں کو ملے ہوئے ہیں۔

سورۂ فاتحہ اور آمین

سورۂ فاتحہ کے خاتمہ پر آمین کہنا سنت ہے۔آمین خود ایک دعا ہے جس کے معنی ہیں استجب یعنی اے اللہ! قبول فرمایا: امین عند اکثر اھل العلم اللھم استجب لنا۔(قرطبی)

چنانچہ حدیث میں ہے کہ:

اذا قال الامام غیر المغضوب علیھم و لا الضالین فقولوا امین، صحیح بخاری ص ۴۲۷، پارہ نمبر ۳ عن ابی ہریرہؓ: ''جب امام غیر المغضوب علیہم ولا الضالین پڑھ چکے تو تم بھی آمین کہا کرو۔''

صحیح مسلم ج اول ص: ۱۷۷ میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: '' اذا قال و لا الضالین فقولوا امین'' جب امام ''و لا الضالین'' کہے تو تم آمین کہا کرو۔

صحیح مسلم ج اول ص ۱۷۴، سنن دارمی ۱۴۶، مسند احمد ج اول ص ۲۰۴ پر ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ: ''ان الامام یقول امین'' امام بھی آمین کہے۔

سنن نسائی ج اول ص ۱۷۴، سنن دارمی ۱۴۶، مسند احمد ج اول ص ۲۰۴ پر ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ: ''ان الامام یقول امین'' امام بھی آمین کہے۔

مصنف ابن ابی شیبہ ص ۲۸ میں وائل اپنے والد ماجد سے روایت کرتے ہیں کہ:

''صلیت مع النبی صلی اللہ علیہ و سلم فلما قال غیر المغضوب علیھم و لا الضالین قال امین''۔

''میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی جب آپ ﷺ نے ولا الضالین کہا تو آپ ﷺ نے آمین بھی کہی''۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم قال اذا امن الامام فامنوا فانہ من و افق تامینہ تامین الملائکۃ غفر لہ ما تقدم من ذنبہ.

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو اس لئے کہ جب تمہاری آمین ملائکہ کی آمین کے ساتھ مل جاتی ہے تو آمین کہنے والوں کے پہلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں'' (اور یہ انعام ہے آمین کہنے کا)۔(صحیح بخاری پارہ ۴۲۵۳، صحیح مسلم ج اول ص ۱۷۶، سنن ابی داؤد ج اول ص ۳۵۳، جامع ترمذی ج اول ص ۲۱۲، سنن نسائی ج اول ص ۷۴، سنن ابن ماجہ ج اول ص ۶۱، سنن دارمی ص ۱۷۴، مسند امام شافعی ص ۵۶، ام امام شافعی ج اول ص ۹۴، مسند امام احمد ج اول ص ۲۰۴، منتقی ابن الجارود ص ۱۰۰، سنن کبریٰ بیہقی ج ۲ ص ۵۷)

کتب احادیث میں اتنی احادیث بیان ہوئی ہیں کہ ان کا شمار کیا جائے تو باقاعدہ کتاب تیار ہو جائے اس پر پوری امت مسلمہ متفق ہے

کہ فاتحہ کے خاتمہ پر آمین کہنا چاہیے کیونکہ یہ سنت ہے لیکن اس میں اختلاف ہے کہ کیا امام اور مقتدی دونوں کو آمین کہنا چاہیے یا صرف مقتدیوں کو؟ آمین جہراً کہنا چاہیے یا سری طور پر؟

بات اگرچہ صاف تھی کہ جو شخص سورۂ فاتحہ کی تلاوت کرے نماز میں یا نماز کے علاوہ سورۃ فاتحہ کے خاتمہ پر آمین کہے۔ اگر وہ سورۂ فاتحہ کو جہراً پڑھے تو آمین بھی جہراً کہے اور اگر سری طور پر پڑھے تو آمین بھی سری طور پر کہے اور امام ہونے کی صورت میں جب نماز جہری ہو تو اس کی جہری رکعتوں میں فاتحہ جہراً پڑھے گا۔ تو مقتدی بھی امام کے وقفوں میں فاتحہ کو پڑھیں اور امام آخری وقفہ کے بعد ذرا ٹھہر کر آمین کہے اور مقتدی بھی امام کے ساتھ آمین میں شریک ہو جائیں تا کہ آمین سب کی بیک زبان ہو جائے اور یہ اجتماعی صورت اپنے اندر بہت حکمتیں اور برکتیں رکھتی ہے۔

افسوس کہ اتنی صاف بات کو بھی اختلاف کی بھینٹ چڑھا دیا گیا اور اختلاف یہاں تک بڑھا کہ ایک دوسرے پر کفر کے فتوے صادر ہوئے۔ مناظرے قائم ہوئے شرطیں لگیں اور دونوں طرف سے فتح حاصل کرنے کے لئے بڑے بڑے اشتہار طبع کرائے گئے جن پر ایک دوسرے کو چیلنج کئے گئے اور کئے جا رہے ہیں۔ الامان والحفیظ۔

یہاں صرف یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ امت مسلمہ میں آج بھی کثیر تعداد جہری نمازوں میں امام و مقتدی سب پکار کر آمین کہنے والوں کی ہے اگرچہ ہمارے ملک پاکستان میں یہ لوگ اقلیت میں ہوں اس کا مشاہدہ حج کے موقع پر بیت اللہ اور مسجد نبوی میں کیا جا سکتا ہے جہاں پوری ملت اسلامیہ کے لوگ موجود ہوتے ہیں۔ تاہم اس ملک میں ہمارے جو بھائی آمین پکار کر نہیں کہتے بلکہ دل ہی دل میں کہہ لیتے ہیں خواہ وہ امام ہوں یا مقتدی یا دل میں بھی نہیں کہتے ان کو یہ بات باور کر لینی چاہیے کہ جو لوگ آمین پکار کر کہتے ہیں وہ کوئی ایسی بات نہیں کرتے جو خلاف سنت ہے لہٰذا ان کو آمین سے چڑ نہیں ہونی چاہیے اور نہ ہی پکار کر کہنے والوں کو دل میں کہہ لینے والوں سے جھگڑا کرنا مناسب ہے بلکہ اپنے عمل میں پختگی اور بلند ہمتی اصل چیز ہے اور اسی پر قائم رہنا ضروری ہے۔ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ۔